پاکستان

قوم پرستی، صوبائی خود مختاری اور عدم مرکزیت
ایک تاریخی جائزہ

عامر ریاض

برگد

وفاق ایک ایسا اتحاد ہے جسے طاقت کے استعمال سے قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ پاکستان میں صوبوں کے باہمی اتحاد کی ضمانت ایک ایسی فضا کا قیام ہے جس میں ہر صوبہ وفاق کے اندر رہنے کو اپنے لئے مفید، کارآمد بلکہ انتہائی ضروری سمجھے۔ پاکستان کے وفاق کے اندر اسے اپنے معاشی و سماجی مفادات کی تکمیل نظر آئے اور علیحدگی کی صورت میں اپنے حقیقی اور محسوس ہونے والے مفادات کو دھچکا لگتا دکھائی دے۔ اتحاد کسی خارجی دباؤ کا نتیجہ نہ ہو بلکہ دلی خواہش کے نتیجے میں وجود میں آنے والا رضا کارانہ پیمان ہو۔

پروفیسر عزیز الدین احمد

عامر ریاض لاہور سے نکلنے والے لیفٹ لبرل رسالہ ''عوامی جمہوری فورم'' کے ایڈیٹر ہیں۔ سہ ماہی رسالوں ''برگد'' اور ''ڈویلپمنٹ ویژن'' سے منسلک ہونے کے ساتھ خصوصی دلچسپی کی کتب بھی چھاپتے ہیں۔ سیاسی سماجی حالات پر گہری نظر کے علاوہ پاکستان کی تعلیمی پالیسیوں اور عدم مرکزیت کے حوالے سے کام آپ کی پہچان ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی اور پنجاب لوک لہر میں کام کرنے کے علاوہ عرصہ چھ سال سے ''عوامی جمہوری فورم'' سے وابستہ ہیں جو بائیں بازو کے حلقوں میں ماضی کی سیاست ونظریات کو از سر نو دیکھنے اور نئے راستے تلاش کرنے سے مستعار ہے۔ عامر ریاض نہ صرف قومیتی، ثقافتی، لسانی، مذہبی ومسلکی تنوع پر یقین رکھتے ہیں بلکہ واشنگٹن سے جاری کردہ مشہور پنجابی ویب اخبار وچار (www.wichaar.com) میں مسلسل لکھتے بھی ہیں۔

عامر ریاض سے اس ای میل پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

newline2100@yahoo.co.uk

مقالہ: پاکستان: قوم پرستی، صوبائی خودمختاری اور عدم مرکزیت
ایک تاریخی جائزہ

مصنف: عامر ریاض

تاریخ اشاعت: جولائی 2009ء

معاونت: ہینرچ بال سٹفٹنگ (HBS)

پبلشر: برگد

پہلی بات

برگد کی طرف سے یہ مقالہ چھاپنے کا مقصد پاکستان کے اس اہم ترین مسئلہ کے حوالے سے نوجوانوں کے ساتھ مکالمے کا آغاز کرنا ہے کہ جس کی ہمیشہ سے بہت ضرورت تھی۔ برگد جمہوری طرز فکر اور امن کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ برگد ہینرچ بال سٹف ٹنگ (HBS) کی مشکور ہے کہ جنھوں نے ہمیں لاہور سے اس مکالمے کو شروع کرنے کے لیے ابتدائی معاونت فراہم کی۔ صوبائی خودمختاری کے حوالے سے اس مقالہ کو بارش کا پہلا قطرہ سمجھیں کہ برگد اس حوالے سے مستقبل میں بھی کام کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

عدم مرکزیت اور تنوع جمہوری بندوبست کے دو لازم جزو ہیں۔ پاکستان میں وفاقی نظام کی مضبوطی کے لیے ان دونوں اصولوں کو تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھا جا سکتا ہے۔ برگد چاروں صوبوں، آزاد کشمیر اور دیگر علاقوں میں موجود نوجوانوں سے مکالمہ کرتے ہوئے یہ اُمید رکھتی ہے کہ ہمارے نوجوان ان معاملات کو امن اور جمہوریت کے استحکام کے ساتھ کبھی متصادم نہ ہونے دیں گے۔

پاکستان میں موجود رنگا رنگ ثقافتوں، قومیتوں، زبانوں اور ان سے وابستہ ادب و تاریخ کو جاننا آج کے پاکستانی نوجوان کے لیے بہت ضروری اَمر ہے۔ یہ اک افسوس ناک بات ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو امریکہ یا یورپ کی تاریخ و ثقافت بارے تو بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں مگر اپنے ہی ملک کے لوگوں، ان کی زبانوں، ثقافتوں بارے اکثر بنیادی حقائق کا علم بھی نہیں ہوتا۔ برگد سمجھتی ہے کہ معلومات کی کمی اور مکالمہ کے فقدان کی وجہ سے آج چاروں صوبوں، آزاد کشمیر اور دیگر علاقوں کے نوجوانوں میں اضطراب بڑھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برگد ایسے مواقع کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے کہ جس کے ذریعے نوجوانوں میں دوریاں کم کی جاسکیں۔ مجھے سینئر ترقی پسند رہنما اور قومیتی، ثقافتی و لسانی تنوع کے علمبردار جناب پروفیسر عزیز الدین احمد کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس مقالہ کے لیے دیباچہ لکھا۔ برگد آئندہ بھی ایسی کاوشیں جاری رکھے گی۔ میں اُمید کرتی ہوں کہ آپ اس مقالے بارے برگد کو اپنی رائے ضرور بھیجیں گے۔

صبیحہ شاہین

Sabiha Shaheen

17 جولائی، 2009ء

صوبائی خودمختاری کا سوال

پاکستان میں صوبائی خودمختاری کا مسئلہ ملک کے اہم ترین سوالات میں سے ایک ہے۔ اسے حل کرنے میں ناکامی کا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہم دیکھ چکے ہیں۔ تاہم ملکی اقتدار پر متصرف فوجی وسول اشرافیہ نے اس المیے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ 1973ء کے آئین کی تیاری کے دوران سیاسی جماعتوں میں اس بات پر اتفاق تھا کہ آئین میں دی گئی خودمختاری کا دائرہ اگلے دس سال میں مزید وسیع کیا جائے گا۔ لیکن ضیاءالحق کے مارشل لا کے دوران صوبوں کی بجائے مرکز کے اختیارات میں اضافہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں مرکز سے بیگانگی بڑھ گئی۔

ضیا مخالف جمہوری تحریک نے ایک مرتبہ پھر سے ملک میں موجود مختلف قومیتوں کو ایک نقطے پر اکٹھا کر دیا۔ یہ احساس پیدا ہوا کہ فوجی آمریت کے خلاف جنگ جیتنے کے لئے ایک ملک گیر مشترکہ جدوجہد ضروری ہے۔ ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران سیاستدانوں نے عہد کیا کہ آمریت کے خاتمے کے بعد جو حکومت بھی برسراقتدار آئے گی وہ قومی حقوق کی بازیابی اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دینے کے لئے ٹھوس اقدامات اٹھائے گی۔ مگر 1988ء کے بعد قائم ہونے والی منتخب حکومتوں کو اپنا دورِ اقتدار مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) میں سے ہر ایک نے دو دو دفعہ حکومت قائم کی مگر دونوں مرتبہ انہیں میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی برخواست کر دیا گیا۔ پھر انہیں جو وقت ملا بھی اس کا بیشتر حصہ انہوں نے ایک دوسرے کی حکومت گرانے کی کوششوں میں ضائع کر دیا۔ صوبائی خودمختاری کا مسئلہ وہیں کا وہیں رہا۔ یہاں تک کہ جنرل پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد تمام اختیارات اپنی ذات میں مرتکز کر دیئے۔ ضلعی حکومتوں کے نظام کے ذریعے جنرل مشرف نے مرکز کے پنجے اضلاع اور تحصیلوں سے لے کر یونین کونسلوں تک گاڑ دیئے۔ مشرف کے اقتدار چھوڑنے کے بعد بھی صوبوں کے حالات جوں کے توں رہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت نے صوبائی خودمختاری کے انتہائی اہم مسئلے پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی بجائے قریباً ایک سال کا عرصہ عدلیہ کے ساتھ جنگ کرنے میں ضائع کر دیا۔ میثاق جمہوریت میں جن آئینی تبدیلیوں کا وعدہ کیا گیا تھا وہ تا حال تشنۂ تکمیل ہے۔

فوجی اور جمہوری حکومتوں کی اس مجرمانہ غفلت شعاری نے صوبوں کے اندر پرانی شکایات کے ساتھ ساتھ بے چینی بڑھانے والے نئے مسائل کو بھی پیدا کر دیا ہے جس سے احساسِ محرومی شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ جب خودمختاری کے مسئلے کو وفاق کے اندر حل کرنے کی کوششیں بارآور ثابت ہوتی نظر نہیں آتیں تو 1940ء کی قرارداد پاکستان پر عملدرآمد کا مطالبہ کیا جاتا ہے جبکہ کچھ لوگ اس سے بھی آگے جا کر علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بات صوبائی خودمختاری سے آگے بڑھ کر قوموں کے حق خودارادیت کی طرف جا رہی ہے۔

ایسے حالات میں جب پاکستان کی فوجی وسول اشرافیہ روایتی شترمرغ کی طرح نہ صرف ریت میں سر دبائے ہوئے ہے بلکہ مسائل اور ان سے پیدا ہونے والے خطرات کا ادراک کرنے سے عاری ہے تو پاکستان کے چاروں صوبوں کے عوام کے درمیان ایک ایسے مکالمے کی ضرورت مزید بڑھ جاتی ہے جو انہیں ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے میں مدد دے۔ حالات اتنی تیزی سے بدل رہے ہیں کہ اگر یہ مکالمہ فوری طور پر شروع نہ کیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں بات چیت کے لئے کوئی مشترکہ بنیاد ہی باقی نہ رہے۔

وفاق ایک ایسا اتحاد ہے جسے طاقت کے استعمال سے قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ پاکستان میں صوبوں کے باہمی اتحاد کی ضمانت ایک ایسی فضا کا قیام ہے جس میں ہر صوبہ وفاق کے اندر رہنے کو اپنے لئے مفید، کار آمد بلکہ انتہائی ضروری سمجھے۔ پاکستان کے وفاق کے اندر اسے اپنے معاشی وسماجی مفادات کی تکمیل نظر آئے اور علیحدگی کی صورت میں اپنے حقیقی اور محسوس ہونے والے مفادات کو دھچکا لگتا دکھائی دے۔ اتحاد کسی خارجی دباؤ کا نتیجہ نہ ہو بلکہ دلی خواہش کے نتیجے میں وجود میں آنے والا رضا کارانہ پیمان ہو۔

پروفیسر عزیز الدین احمد

16 جولائی 2009ء۔ لاہور

پروفیسر عزیز الدین احمد قومیتی حقوق اور صوبائی خود مختاری کے حوالے سے مخصوص نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ آپ کا شمار ان پنجابی ترقی پسندوں میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے 60ء اور 70ء کی دہائیوں میں بھرپور ترقی پسند سیاست کی۔ آپ کا لگایا ہوا پودا ''نیشنلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن'' (NSO) پنجاب کی ترقی پسند طلباء تحریک میں نمایاں مقام کی حامل رہی ہے۔ آپ کی کُتب میں ہم غریب کیوں ہیں؟، کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں؟، پنجاب اور بیرونی حملہ آور (پنجابی اور اُردو میں) اور پاکستان میں طلباء تحریک شامل ہیں۔ آج کل آپ انگریزی روزنامہ دی نیشن سے وابستہ ہیں۔

تعارف

62 سال گزرنے کے باوجود پاکستان میں صوبوں، زبانوں، قومیتوں، ثقافتوں اور مسالک میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوسکی۔ اتحاد کا فقدان تو اپنی جگہ، بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ یہ صورتحال جہاں پاکستان کی یکجہتی کے حوالے سے تشویشناک ہے وہیں یہ تکرار ان صوبوں، زبانوں، قومیتوں، ثقافتوں اور مسالک سے وابستہ لوگوں کے لیے بھی خوش آئیند نہیں۔ یہ مقالہ یکجہتی اور ہم آہنگی بارے اخلاقی اپیل کی بجائے اس بات کا متقاضی ہے کہ آیئے ایک بار پھر ان الجھنوں کو زیر بحث لایا جائے۔ تعصّبات اور مفروضوں سے صرف نظر کرتے ہوئے یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ مسائل کی جڑ کہاں ہے۔ غربت، پسماندگی اور بے روزگاری میں جکڑے چاروں صوبوں اور دیگر علاقوں کی عوام امید لگائے بیٹھی ہے کہ شاید ان کے مسائل کا مداوا ہو سکے۔ کسی ایسے تصفیہ پر پہنچنے کے لیے یہ مقالہ اگر اس حوالے سے ملک بھر کے نوجوانوں کے درمیان مکالمہ کا آغاز کر سکے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ چار صوبائی اکائیوں اور دیگر علاقوں پر مشتمل ملک پاکستان میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس ملک کے قیام سے قبل ان علاقوں میں بہت سے قومیتی وثقافتی گروہ موجود تھے۔ یہ رنگا رنگ زبانیں، قومیتیں اور ثقافتیں پاکستان کی پہچان ہیں۔ آج پاکستان کو ایسی پالیسی کی ضرورت ہے جس کے ذریعہ یہ تنوع پاکستانی عوام بالخصوص پچھڑے ہوئے طبقات وگروہوں کے مفاد میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ تاہم اس کا آغاز تو اس تنوع کو تسلیم کیے بغیر نہیں ہوسکتا۔ خوش قسمتی سے 1973ء کے اصل آئین میں صوبوں کی جغرافیائی حیثیت اور رنگا رنگ ثقافتوں اور زبانوں کو تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ 1973ء کا آئین تھا کہ جس نے صوبوں کی جغرافیائی حیثیت کو آئینی تحفظ دیا۔ اس ضمن میں صوبائی خودمختاری اور قومیتی سیاست کے علمبرداروں نے کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اس ضمن میں بابائے بلوچستان غوث بخش بزنجو (مرحوم) کا نام سرِفہرست ہے۔ یوں پاکستان میں مرکز کی حمایت سے صوبوں کو توڑنے کی وہ روائیت پنپ نہ سکی جس نے بھارتی جمہوریت کو داغدار کیا ہوا ہے۔ یہ آئینی تحفظ وفاق پاکستان کی مضبوطی کی ضمانت بنا مگر ضیاء الحق دور میں جس طرح محض اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے قومیتوں، ثقافتوں اور زبانوں میں جھگڑے بڑھائے گئے اس نے وفاقیت پر ضرب کاری لگائی۔ آٹھویں ترمیم اک منحوس سایہ کی طرح آج بھی جمہوری قوتوں کا منہ چڑا رہی ہے۔ صوبوں کی جغرافیائی حیثیت تسلیم کرنے کے بعد پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں اور ثقافتوں کو تعلیمی نصاب کا حصہ بنانا اور مادری زبانوں کو معتبر مقام دینا، وفاق پاکستان کے لیے دوسرا سنگ میل بن سکتا تھا کہ جو تا حال التواء کا شکار ہے۔ وفاق کی مضبوطی کے لیے تیسرا قدم عام لوگوں کو روزمرہ کے مسائل کے حوالے سے فیصلہ سازی میں شریک کرنے سے مستعار ہے جسے عرف عام میں مقامی حکومتیں یا بلدیاتی نظام کہتے ہیں۔ بدقسمتی سے صوبائی بیوروکریسی کی تقلید میں قومیتی وصوبائی قیادتیں اس اہم مسئلہ سے صرف نظر کرتی رہی ہیں جو عدم مرکزیت کے حوالے سے ان کے نقطہ سے لگا نہیں کھاتا۔ آج پاکستان میں ایسے وفاقی بندوبست کی ضرورت ہے جو ان تینوں سطحوں (وفاقی، صوبائی وضلعی) پر جمہوری پارلیمانی روایات کے تحت بنایا جائے۔ مضبوط مرکز، بے اختیار صوبے اور بے ضرر بلدیاتی بندوبست وفاق پاکستان کی مضبوطی میں منفی کردار ہی ادا کرسکتا ہے۔ کم ازکم 62 سالہ تجربہ یہی سبق لیے ہوئے ہے۔ دوسری طرف مرکز کو محض تین شعبہ جات دینے پر مشتمل بندوبست کی نظیر نہ تو کسی جنوبی ایشیائی ملک میں ملتی ہے اور نہ ہی ترقی یافتہ ممالک میں۔ آج ضرورت اس اُمر کی ہے کہ ان دونوں انتہاؤں میں سے درمیانی راستہ نکالا جائے تا کہ سیاسی قیادتیں بے روزگاری، پسماندگی اور غربت جیسی عفریتوں سے نمٹنے کی طرف توجہ دے سکیں۔

پاکستان

قوم پرستی، صوبائی خودمختاری اور عدم مرکزیت

ملک پاکستان میں پہلے روز سے دانشوروں، پالیسی سازوں اور مقتدر لوگوں کا اک ایسا گروہ موجود رہا ہے جو صوبائی خودمختاری کو صوبائیت اور علیحدگی پسندی سے الگ کر کے دیکھنے کے فہم سے بوجوہ عاری ہے۔ یہ گروہ مرکزیت پسندی کو پاکستانی قوم پرستی کا جزو لاینفک متصور کرتے ہوئے ایسی پالیسیوں کی حمایت کرتا رہا ہے جو براہ راست وفاقیت کی روح سے متصادم ہیں۔ اس مقالہ میں کوشش کی جائے گی کہ پاکستان میں گذشتہ 62 سالوں میں وفاقی، وحدانی اور کنفیڈرل نظاموں کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں کا جائزہ لیتے ہوئے تمام ممکنہ پہلوؤں کو زیرِ غور لایا جائے۔ اس مقالے کا مقصد کسی گھڑے گھڑائے فارمولا کو من و عن پیش کرنا نہیں بلکہ صوبائی خودمختاری کے حوالے سے اک بحث کا آغاز کرنا ہے۔ یہ بحث پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس موضوع پر خصوصاً آج کے پاکستانی نوجوان جذبات، نعرے بازی اور بلند و بانگ دعوؤں سے ہٹ کر بات کر سکیں۔

پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی میں ہونے والی بحثوں سے لے کر موجودہ ''نئے صوبوں کی تشکیل'' کے حوالے سے داغے گئے بیانوں، تبصروں اور کالموں تک جو بات اظہر المن الشمس ہے وہ ہے اک سنجیدہ، قابل فہم اور زمینی حقائق سے لگا کھاتے ہوئے مکالمہ کی کمی۔ اکثر تو ایسے مکالمے کو غداری، علیحدگی پسندی اور خارجی سازش قرار دے کر دیس نکالا دے دیا جاتا ہے جبکہ دوسری طرف سیاسی دکان چمکانے والے ایسے ''شہباز'' بھی ہیں جو اس اہم مسئلہ کو نعرے بازی اور جذباتیت سے بوجوہ آگے نہیں جانے دیتے۔ جغرافیہ سے منسلک قوم پرستی کی تاریخ تو شاید کچھ زیادہ قدیم نہیں البتہ لسانی ثقافتی حوالوں سے منسلک شناختیں اتنی ہی قدیم ہیں کہ جتنی ان سے وابستہ زبانوں اور ثقافتوں کی اپنی قدامت۔[1] پاکستان میں قومیتی حقوق، صوبائی خودمختاری اور مرکز گریزیت کی تاریخ بیان کرنے سے قبل تاریخی پس منظر[2] دینا بہت ضروری ہے۔

ٹوٹتی ہوئی بادشاہتیں اور طاقت کے نئے مراکز

بالعموم عہدِ قدیم و عہدِ وسطیٰ اور بالخصوص آخری با اثر مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر (1707) تک جنوبی ایشیاء میں بادشاہتوں اور قبائلی سرداریوں کا راج رہا ہے کہ جس میں مرکزیت پسندی کو راج نیتی میں مسلمہ فوقیت حاصل تھی۔ اس مرکزیت پسندی کا آج کی جدید مرکزیت پسند ریاست سے مقابلہ مشکل ہوگا کہ اس زمانہ میں تو دارالخلافہ میں بیٹھ کر ہی حکومت ہوتی تھی۔ اورنگزیب کے بعد بنگال سے پنجاب تک مرکز کی آشیرباد کے بغیر حکومتیں بنانے کے سلسلوں میں تیزی

دیکھی گئی۔ یہ وہی وقت تھا جب ایک طرف ڈچ، فرانسیسی اور انگریز ان خطوں میں دلچسپی لے رہے تھے تو دوسری طرف مقامی طاقت کے مظاہر اپنا زور صرف کر رہے تھے۔ تقریباً 96 سال کے عرصہ میں یعنی 1799ء تک انگریزی طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے ماسوائے پنجاب، سندھ، کشمیر، سرحد و بلوچستان، تمام خطوں پر قابض ہو چکی تھے۔ پنجاب، سرحد اور کشمیر کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے لیے کمپنی بہادر کو مزید پچاس سال انتظار کرنا پڑا جبکہ سندھ کے حکمرانوں کو انگریزوں نے جلد ہی اک معاہدہ (1809) کے ذریعے ''رام'' کر کے بلوچ علاقوں تک مشروط رسائی حاصل کر لی تھی۔ 1707ء سے 1849ء کے درمیان، بنگال، اودھ اور پنجاب جیسی مرکز سے آزاد ریاستوں کے قیام نے عدم مرکزیت کے ماڈل کو اُسارنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ 1799ء کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زیرِ قیادت بننے والی سرکار ''لہور دربار'' کو سیاسیات کے حوالے سے اک منفرد مقام حاصل ہے کہ اس نے جدید ریاست کے بہت سے اہداف حاصل کیئے۔

گو معاہدہ امرتسر (1809) کے بعد ستلج پار کے بہت سے پنجابی علاقے مہاراجہ کی دسترس سے باہر رہے تاہم کشمیر، لداخ، پشاور اور افغانستان سے متصل قبائلی علاقہ جات تک پھیلی ''لہور دربار'' کی حکومت کو منظّم تربیت یافتہ اور تنخواہ دار فوج، قاضی، کوتوال، محلّہ داری بندوبست اور پنچایتی نظام کی موجودگی میں اسے اک خاص خودمختاری حاصل رہی۔ اس دور کی حکومتوں کو جمہوریت اور تنوع کے اصولوں سے پرکھنا تو شاید اک غلط فہمی کے علاوہ کچھ نہ ہوگا کہ خود کمپنی بہادر کی انگریزی حکومت بھی ان زریں اصولوں سے مبرا تھی۔

98 سالہ انگریزی دور اقتدار اور برٹش انڈیا

29 مارچ 1849ء میں پنجاب پر قبضہ کے بعد عملاً اس خطہ پر انگریزی اقتدار قائم ہو گیا۔ یاد رہے 1813ء کے چارٹر ایکٹ کے بعد برطانوی پارلیمنٹ نے کمپنی کے اختیارات کو محدود کرنا شروع کر دیا تھا جبکہ 1835ء کی لارڈ میکالے کی تقریر اس بات کی گواہ ہے کہ برطانوی سرکار عسکری مفادات کے تحت کچھ اور سوچ رہی تھی۔ ان عسکری مفادات کا اُلار دریائے آمو سے آگے بڑھتے ہوئے زار روس کی طرف تھا کہ جس کے لیے 1848ء کی برطانوی پارلیمنٹ میں آزاد خودمختار پنجاب حکومت کو گرانے کے حق میں دلائل دیئے گئے۔[3]

اس پالیسی کو فرنٹیئر فارورڈ پالیسی کے عنوان کے تحت یاد کیا جاتا ہے کہ جس کے واضح اہداف میں زارِ روس اور برطانوی ہند کے درمیان آزاد علاقوں کو بتدریج انگریزی عملداری میں لانا اور ان زیرِ تسلط علاقوں میں ایسا مرکزیت پسند سٹرکچر اُسارنا تھا جو فرنٹیئر فارورڈ پالیسی میں معاون ہو۔ پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد فرنٹیئر فارورڈ پالیسی کے تحت اگلا ہدف افغانستان تھا کہ جس کے لیے پنجابیوں اور بعد ازاں پختونوں کو زیادہ تعداد میں فوج میں بھرتی کرنا اہم قرار پایا۔ یہی وہ پالیسی تھی جس کے تحت پنجاب پر قبضہ کے بعد بنگال، بہار، اودھ کے لوگوں پر مشتمل رائل بنگال آرمی کو مرحلہ وار نوکریوں سے فارغ کیا گیا۔ 1857ء میں اس تطہیر کا ردِّعمل خودساختہ جنگ آزادی میں دیکھنے میں آیا کہ جس کی ناکامی کا قرعہ پہلے سے نکل چکا تھا۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ 1846ء سے 1849ء کے درمیان پنجاب سرکار گرانے کے لیے لڑی جانے والی تین بڑی جنگوں کے دوران اگر رائل بنگال آرمی نے انگریزوں کی بجائے پنجاب سرکار کا ساتھ دیا ہوتا تو 1857ء کے واقعات کبھی رونما ہی نہ ہوتے۔

پنجاب سرکار گرانے سے قبل 1837ء میں گورنر جنرل نے پانچ سو سال سے جاری فارسی زبان کو دیس نکالا دیا اور انگریزی کو مسلط کر ڈالا۔ تاہم 1849ء کے بعد اس پالیسی کو پنجاب و کشمیر میں بھی لاگو کیا گیا۔ پنجاب میں فوراً جبکہ سرحد اور کشمیر کے علاقوں میں بعد ازاں انگریزی کے ساتھ ساتھ اُردو کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو فرنٹیئر فارورڈ پالیسی کا ہی شاخسانہ تھا۔ بنگال اور سندھ جیسے علاقوں میں تو مادری زبانوں کو جگہ دی گئی تاہم فرنٹیئر پالیسی کے زیر انتظام علاقوں میں مادری زبانوں کو خطرہ قرار دیا گیا۔ لارڈ میکالے کے فرمان کے مطابق نئے تعلیمی بندوبست کو پادریوں کی مخالفت کے باوجود، مذہب کے فروغ کے لیے استعمال نہ

کرنے کا فیصلہ تو کیا گیا مگر فرنٹیئر فارورڈ پالیسی کے زیر انتظام خطوں میں اس فیصلہ پر عمل کو بھی عسکری مفادات کے تابع ہی رکھا گیا۔

ڈیورنڈ لائن کا معاہدہ اور اس کے اثرات (1893)

1893ء کے ڈیورنڈ لائن کے معاہدے تک انگریزوں نے اپنے بہت سے اہداف مکمل کر لیے مگر ساتھ ہی ساتھ مضبوط مرکز کی موجودگی میں محدود انتخابی عمل کے تحت مقامی حکومتوں کے نظام کو بھی چلاتے رہے۔ مقامی حکومتوں کے نظام کی ابتداء تو 1850ء کے ایکٹ سے ہوتی ہے کہ جب پنجاب کے دو اضلاع دہلی اور مری میں اسے آزمائشی طور پر شروع کیا گیا۔ بعدازاں 1872,1861 اور 1892ء میں اسے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلایا گیا۔
انیسویں صدی کے آخری سالوں میں جب ڈسٹرکٹ بورڈوں کا نظام متعارف کروایا گیا تو پنجاب کے دور دراز کے اضلاع جیسے پشاور، ڈیرہ جات، کوہاٹ، ہزارہ بھی اس سے مستفید ہونے گے۔ یادرہے، صوبائی حکومتوں کو مضبوط کرنے سے قبل مقامی حکومتوں کو کھڑا کرنے کی انگریزی پالیسی کے پیچھے وہی سوچ کارفرما تھی جسے ساٹھ سال بعد پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے بخوبی استعمال کیا۔ 1901ء میں پشاور، کوہاٹ، ہزارہ جیسے اضلاع کے لوگوں کو محدود صوبائی و مقامی اختیارات سے بھی اس وقت محروم کر دیا گیا کہ جب لارڈ کرزن نے چھ اضلاع کو پنجاب سے علیحدہ کر کے صوبہ سرحد کے نام سے الگ صوبہ بنانے کا اعلان کر دیا۔ ان اضلاع کے لوگوں کو 1935ء میں جا کر صوبائی و مقامی حکومتوں کے محدود اختیارات دوبارہ ملے۔

آئینی اصلاحات اور بدلتی سیاستیں (1909)

1909ء سے 1947ء کے آزادی ہند ایکٹ تک انگریزوں نے بتدریج اختیارات دینے کی طرف قدم بڑھائے۔ منٹو مارلے اصلاحات (1909) میں جب جداگانہ انتخابات کے حق میں انگریزی پالیسی آئی تو قانون ساز اسمبلی میں اس کے خلاف تقریریں کرنے والوں میں محمد علی جناح بھی شامل تھے۔ اس دور میں انہیں گمان تھا کہ یہ پالیسی مسلمانوں اور ہندوؤں کو لڑانے کے لیے لائی گئی ہے اور مسلمان، ہندوؤں سے اپنے معاملات خوش اسلوبی سے طے کر لیں گے۔ 1916ء کا لکھنو پیکٹ بھی ایسی ہی کاوشوں کا تسلسل تھا مگر مسلم اکثریتی صوبوں نے بجا طور پر اسے اپنی خود مختاری پر حملہ تصور کیا۔ لاہور سے میاں محمد شفیع[4] اور دہلی سے حکیم اجمل خاں[5] جیسے دانشوروں نے یہ کہا اس معاہدہ پر اگر عمل ہوا تو انڈین مسلمانوں کی دو صوبوں میں موجود اکثریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یوں عملاً برٹش انڈیا میں کوئی ایک صوبہ بھی ایسا نہ ہو گا جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں۔ یادرہے 1847ء میں انگریزی سرکار نے سندھ کو بمبئی کا حصہ بنا دیا تھا جبکہ سرحد میں صوبائی اختیارات محدود تھے۔ یوں لکھنو پیکٹ کے تحت ہونے والی بحث اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ صوبوں کی مرضی کے بغیر جو بھی کل ہند کی سطح پر فیصلہ کیا جائے گا وہ بے ثمر ہی رہے گا۔

چیمسفورڈ اصلاحات اور صوبوں کی مضبوطی (1919)

1919ء کی چیمسفورڈ اصلاحات کو صوبائی خود مختاری کے حوالے سے کلیدی حیثیت اس لیے حاصل ہے کہ ان اصلاحات کے تحت صوبوں کو توانا اور مضبوط ہونے کا موقع ملا۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں سندھ بمبئی کا حصہ نہ ہوتا، سرحد کو محدود صوبائی اختیارات کے شکنجے میں نہ رکھا ہوتا اور بلوچستان کو صوبہ بنایا ہوتا تو کم از کم مغربی پاکستان کے صوبوں میں انفراسٹرکچر، تعلیم اور ترقی کے حوالے سے قیام پاکستان کے وقت اتنا فرق نہ ہوتا کہ جس نے بعدازاں پاکستانی سیاست پر گہرے اثرات ڈالے۔
صوبوں میں ذمہ دار حکومتیں متعارف کرتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء نے بہت سے صوبائی محکمے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیئے۔ ان میں

تعلیم، پبلک، ہیلتھ، لوکل سیلف گورنمنٹ، پبلک ورکس اور صنعت جیسے امور شامل تھے۔ جبکہ فنانس، پولیس، انتظامیہ وغیرہ جیسے محکموں پر گورنروں کے ذریعے غیر منتخب بیوروکریسی کی حاکمیت برقرار رکھی۔[6] گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء ہی وہ قانون ہے جس میں مرکزی سطح پر امپریل کونسل ختم کر کے دو نئے ادارے بنائے گئے۔ (1) مرکزی قانون ساز اسمبلی (2) ریاستوں کی کونسل۔ گو آج کے جمہوری تقاضوں کی روشنی میں اس بندوبست پر بہت تنقید کی جاسکتی ہے تاہم بالعموم صوبوں نے ان محدود اختیارات کے تحت بہت سے کام ضرور کیے۔ ایک مثال پنجاب کے میاں سر فضل حسین کی ہے جنہوں نے لڑکوں کے لازمی پرائمری تعلیم کے بل پر ایسے عملدرآمد کروایا کہ جس کی نظیر بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں ہند، سندھ میں کہیں نہیں ملتی۔ ''پنجاب کے علاوہ دیہی علاقوں میں لازمی تعلیم کی ترقی بہت سست رہی ہے۔ ہندوستان کے پانچ لاکھ دیہاتوں میں سے صرف تقریباً 13072 دیہاتی علاقے لازمی تعلیم کے تحت لائے گئے۔ ان میں سے تقریباً 10450 صرف پنجاب میں تھے۔''[7]

جدول نمبر 2

لازمی تعلیم کے تحت آنے والے علاقے

صوبہ	میونسپلٹیاں اور شہری علاقے	ڈسٹرکٹ بورڈ اور دیہی علاقے
مدراس	21	3
بمبئی	6	-
صوبہ جات متحدہ (یوپی)	25	-
پنجاب	57	1499
بہار اور اڑیسہ	1	3
سنٹرل پراونسز	3	22
دہلی	1	-
میزان	114	1571

1921ء سے 1933ء کے حالات کا اگر جائزہ لیا جائے تو تعلیم ہی نہیں بلکہ سیاسی جاگرتی میں بھی صوبوں کا کردار بتدریج آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی، بنگال میں کرشک پرجا پارٹی، سرحد میں پختونوں کی تحریکیں اور صوبائی حقوق کی بحالی کی لہر جبکہ سندھ میں بمبئی سے علیحدگی کی تحریک کو اسی دور میں تقویت ملی۔

نہرو رپورٹ، 14 نکات اور صوبوں کے حقوق

اگر آپ بیسویں صدی کے تیسرے عشرے کے آخری سالوں میں منظر عام پر آنے والی دو اہم تجاویز یعنی نہرو رپورٹ اور 14 نکات کا موازنہ کریں تو صوبائی خود مختاری کے حوالے سے چودہ نکات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء کے تحت صوبوں اور مرکز کو الگ الگ اختیارات حاصل تھے البتہ جو اختیارات صوبائی یا مرکزی فہرست میں نہیں آتے تھے

ان کا معاملہ انتہائی متنازعہ تھا۔ ایسے اختیارات کو باقی ماندہ شعبہ جات یعنی Residuary Powers کہتے تھے۔ ان باقی ماندہ شعبہ جات کو صوبوں یا مرکز کو دینے کے حوالے سے اک بحث مضبوط مرکز اور صوبائی حقوق کی حمایت کرنے والوں کے درمیان موجود تھی۔

جواہر لعل نہرو کے والد موتی لعل نہرو نے جب اگست 1928ء میں اپنی رپورٹ پیش کی تو اس میں باقی ماند شعبہ جات مرکز کو دینے کی سفارش کی گئی۔ جبکہ مارچ 1929ء میں محمد علی جناح کے پیش کردہ چودہ نکات میں باقی ماندہ شعبہ جات صوبوں کو دینے کی سفارش کی گئی۔ دونوں رپورٹوں میں صوبوں کے حقوق کے حوالے سے الگ الگ سفارشات موجود تھیں جو بدلے ہوئے سیاسی منظرنامہ کی طرف اشارے کر رہی تھیں۔ نہرو رپورٹ نے اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستوں کی سفارش تو کی مگر جب بنگال اور پنجاب میں ایسی نشستوں کو نہ رکھنے کی سفارش کی تو اس پر پنجابیوں اور بنگالیوں نے تحفظات کا اظہار کیا۔ یاد رہے پنجاب میں کانگرس سے الگ ہو کر نئی جماعت مجلس احرار اسلام (1929) بنانے والے پنجابیوں نے بھی اسی نقطہ کو بنیاد بنا کر نہرو رپورٹ کی مخالفت کرتے ہوئے الگ راہ اپنائی تھی۔[8] دونوں ہی رپورٹوں میں سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے اور صوبہ سرحد و بلوچستان کو مکمل صوبائی حیثیت دینے کی سفارشات بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ صوبائی قیادتوں کو راج نیتی (Power Politics) میں موثر جگہ مل رہی تھی۔

نہرو رپورٹ نے نئے صوبے بنانے کی بات کی تو چودہ نکات میں یہ کہا گیا کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں مرکز کوئی ایسی کارروائی نہیں کرے گا جس سے مسلم اکثریت کو بدلا جانا مقصود ہو۔ یوں یہ لکھنو پیکٹ سے مراجعت بھی تھی اور مرکز کی من مانیوں بارے تحفظات کا اظہار بھی تھا۔

1935ء کا ایکٹ اور صوبوں کی مضبوطی

1935ء کے ایکٹ کے وقت سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے صوبہ بنا دیا گیا جبکہ سرحد کو پنجاب و بنگال جیسے صوبائی حقوق دے دیئے گئے۔ ایک طرح سے یہ مسلم اکثریتی صوبوں میں اضافہ تھا البتہ بلوچستان کی صوبائی حیثیت کو تسلیم نہ کیا گیا۔ 1935ء کے ایکٹ میں مضبوط مرکز تو قائم و دائم رہا البتہ صوبوں کو زیادہ حقوق ضرور ملے۔ 1935ء کے ایکٹ میں صوبوں میں محدود خودمختاری کے ساتھ ساتھ معروف جمہوری بندوبست یعنی کابینہ نظام بھی متعارف کروایا گیا۔ گو ایک آدمی ایک ووٹ جیسا جمہوری بندوبست نہیں تھا نہ ہی مرکزی قانون ساز اسمبلی و حکومت بارے وضاحت تھی مگر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935) کے معماروں کے نزدیک یہ جمہوری نظام کا مرحلہ وار نفاذ تھا۔

انتخابات 1937ء اور نئی صف بندیاں

1937ء میں ہونے والے انتخابات کے نتائج نے برٹش انڈیا میں نئی سیاست کی صف بندیاں کر دیں۔ کل گیارہ صوبوں میں سے سات میں کانگرس نے حکومت بنا کر اپنی برتری ثابت کی مگر وہ یہ بات بھول گئے کہ اس فتح میں ''مخالف قوتوں کا اتحاد'' بھی چھپا ہوا ہے کہ جو جمہوری بندوبست کا ایک مخصوص انگ ہوتا ہے۔

1935ء کے ایکٹ کے تحت بہار سے اڑیسہ، سندھ سے بمبئی اور برٹش انڈیا سے برما و عدن کی علیحدگی کے بعد گیارہ صوبے یہ تھے۔

1- پنجاب 2- بنگال 3- سرحد 4- سندھ 5- صوبہ جات متحدہ (یو پی) 6- بمبئی 7- مدراس 8- صوبہ جات مرکزی (سی پی) 9- آسام 10- اڑیسہ 11- بہار

مدراس، بنگال، بمبئی، صوبہ جات متحدہ، بہار اور آسام میں صوبائی سطح پر قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز کونسل کے نام سے دو الگ الگ ادارے بنائے گئے جبکہ پنجاب، سندھ، سرحد، اڑیسہ اور صوبہ جات مرکزی میں محض قانون ساز اسمبلیاں ہی بنائی گئیں۔[9] مرکزی حکومت سے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر عملدرآمد کو مؤخر کیا گیا جبکہ صوبوں سے متعلق حصہ کو یکم اپریل 1937ء سے نافذ کر دیا گیا۔ 1937ء کے انتخابات میں فتح یاب ہونے والی کانگرس کل 1585 سیٹوں میں سے 711 نشستیں جیت سکی تھی جو نصف سے بھی کم تھیں۔ علاوہ ازیں دوسری اہم سیاسی پیش رفت یہ تھی کہ کانگرس برٹش انڈیا کے دو

بڑے صوبوں میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ یہ صوبے تھے متحدہ بنگال اور متحدہ پنجاب۔ 1938ء میں ان دونوں صوبوں کے تحفظات دور کرنے کی بجائے کانگرس نے یہاں ''مسلمانوں سے عوامی رابطہ'' کے نام سے مہم چلائی کہ جس کا مقصد دونوں صوبائی حکومتوں کو عدم تحفظ کا شکار کرنا تھا۔ اس مہم میں مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر اشرف (مشہور کمیونسٹ دانشور) آگے آگے تھے۔[10]
بنگال میں ابوالقاسم فضل الحق (1962-1873) کی کرشک پرجا پارٹی (عوامی کاشتکار پارٹی) نے مسلم لیگ کے ساتھ مل کر حکومت بنائی اور اے کے فضل الحق متحدہ بنگال کے وزیر اعظم بنے۔ فضل الحق، میاں سر فضل حسین کی مانند 1924ء میں نہ صرف بنگال کے وزیر تعلیم رہ چکے تھے بلکہ 1935ء میں کلکتہ کے پہلے مسلم میئر بن کر بھی شہرت کما چکے تھے۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے میدان مارا اور سر سکندر حیات بلا شرکت غیرے وزیر اعظم پنجاب بنے۔ سر چھوٹو رام اور میاں سر فضل حسین نے جو پودا لگایا تھا وہ اب تناور درخت بن چکا تھا۔ سرحد میں صاحبزادہ سر عبدالقیوم خان کی حکومت بنی جسے 1938ء میں کانگرس کی آشیر باد سے خان عبدالغفار خان اور خان عبدالقیوم خان نے چلتا کیا۔[11] یوں 1937ء کے انتخابات میں کانگرس 5 صوبوں یو پی، سی پی، بہار، مدراس اور بمبئی میں کامیاب ہوئی جبکہ اگلے برس تک سرحد اور اڑیسہ میں بھی حکومت بنانے میں کامیاب رہی۔ 1938ء کے سال کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس سال دو بڑے صوبوں نے ایک اور انداز سے مشترکہ جدوجہد کے لیے راستے تلاش کیے۔ ایک طرف ابوالقاسم فضل الحق مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو دوسری طرف وزیر اعظم پنجاب کے ساتھ محمد علی جناح نے اک اہم معاہدہ کیا جسے جناح سکندر پیکٹ کہتے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ 1937ء میں کانگرس وازتیں بننے کے بعد محمد علی جناح نے جواہر لعل نہرو کو مفاہمت کے خطوط لکھے تھے مگر جواہر لعل نہرو کی طرف سے طنزیہ جواب ملنے پر انہوں نے بھی نئی راہیں تلاش کیں۔ مشہور کانگرسی رہنما کانجی دوار کاداس[12] اور مشہور آئینی ماہر ایچ ایم سیروائی نے اپنی کتب[13] میں کانگرس کے اس سیاسی رویہ کی خوب خبر لی ہے۔ پنجاب اور بنگال کی مدد کے بعد ہی تاریخی قرارداد لاہور منظور کی گئی جو اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ صوبے اور صوبائی قیادتیں اگر اپنا وزن استعمال نہ کرتیں تو پھر مسلم لیگ کے لیے اپنے اہداف کا حصول نہ ممکن ہوتا۔ پاکستان میں قومیتی سیاست کے علمبردار اکثر اس قرارداد کا حوالہ دیتے ہیں مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس قرارداد میں ''وفاق'' کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔[14]

کمزور مرکز مضبوط صوبے اور کابینہ مشن پلان

صوبائی خودمختاری کے حوالے سے برطانوی عہد میں ہونے والی آخری بڑی کاوش کابینہ مشن پلان تھا جو 16 مئی 1946ء کو پیش کیا گیا۔ کابینہ مشن پلان سے قبل 1946ء کے انتخابات ہو چکے تھے۔ ان انتخابات میں مرکزی اسمبلی کی 102 نشستوں میں سے 57 کانگرس جبکہ 30 مسلم لیگ نے جیتیں تھیں۔ ''قوم پرست مسلمان، آزاد امیدوار اور ہندو مہاسبھا سب شکست کھا گئے تھے۔[15]

19 فروری 1946ء کو برطانوی وزیر اعظم ایٹلی نے ہاؤس آف کامن سے خطاب کرتے ہوئے کابینہ مشن کا اعلان کیا۔ اسی ہفتہ کے دوران بمبئی میں رائل انڈین نیوی میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ مگر سردار پٹیل کی مداخلت کے بعد جواہر لعل نہرو نے بیگم ارونا آصف علی کی بمبئی آنے کی دعوت کو مسترد کرتے ہوئے اس بغاوت کی حمایت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔[16] یہ واقعہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ کچھ عناصر انگریز کے ساتھ سیاسی قیادت کے سمجھوتہ کے حوالے سے تحفظات رکھتے تھے مگر کانگرس نے سیاسی مصلحت کے تحت ''ہندوستان چھوڑ دو'' سے مراجعت کو ضروری سمجھا۔

24 مارچ 1946ء کو کابینہ مشن نے دہلی میں قدم رنجا فرمایا۔ کابینہ مشن نے اعلان کیا کہ اگر کوئی ایک جماعت بھی کابینہ مشن کو نہیں تسلیم کرے گی تو بھی کابینہ مشن پلان کو ماننے والی جماعت کو حکومت سازی کا موقعہ دیا جائے گا۔ کانگرسی قیادت نے اس بیان سے یہ تاثر لیا کہ شاید انگریز، جناح صاحب کو دھمکی دے رہے

ہیں اور اب کانگرس کو اقتدار منتقل ہونے کو ہے۔مشہور سیاست دان سر تیج بہادر سپرو نے کانگرس کی اس خوش فہمی بارے کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر کانجی دوارکا داس کو خط بھی لکھا۔[17]

جب کابینہ مشن پلان دہلی آیا تو کانگرس کی صدارت مولانا آزاد کے پاس تھی۔6اپریل1946ءکو کابینہ مشن کے ساتھ مولانا آزاد نے جو گفتگو کی اس میں مضبوط صوبوں کے ساتھ ایسا مرکز بنانے کی تجویز رکھی جس کے پاس تین محکمے دفاع، کمیونیکیشن اور خارجہ امور ہوں۔اس سے قبل مولانا عبیداللہ سندھی[18]اور سر سکندر[19] بھی اس سے ملتی جلتی تجاویز پیش کر چکے تھے۔12اپریل کو کانگرس کے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں بھی مولانا آزاد نے کمزور مرکز کے حوالے سے اپنی تجاویز پیش کیں۔مولانا کے بقول اس وقت گاندھی جی نے ان تجاویز کو سراہا تھا۔البتہ سردار پٹیل نے مرکز کے لیے تین تجویز کردہ محکموں کے علاوہ صنعت، مالیات، کرنسی و تجارت کا اضافہ کرنے کو کہا تھا۔مولانا آزاد باقی ماندہ شعبہ جات بھی صوبوں کو دینے کی بات کر کے نہرو رپورٹ اور چودہ نکات میں فاصلے ختم کرنے کی طرف بڑھ رہے تھے۔کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں سمیت 400 سے زائد خواتین وحضرات سے ملاقاتیں کرنے کے بعد16 مئی1946ءکو کابینہ مشن نے اپنا حتمی منصوبہ پیش کیا جو یہ تھا

1- انڈیا ایک یونین ہوگا جس کے ماتحت برٹش انڈیا اور ریاستوں پر مشتمل تمام علاقے ہوں گے۔یونین کے پاس تین شعبے خارجہ اُمور، دفاع اور کمیونیکیشن ہوں گے۔ان شعبہ جات کو چلانے کے لیے یونین رقوم اکٹھی کرنے کی مجاز ہوگی۔

2- یونین میں برٹش انڈیا اور ریاستوں کے ایگزیکٹو اور ایک مجلس قانون ساز ہوگی۔

3- تین شعبہ جات کے علاوہ تمام اُمور بشمول باقی ماندہ شعبہ جات بارے صوبوں کو مکمل خودمختاری ہوگی۔

4 ریاستوں کے پاس بھی یونین کے تین شعبہ جات کے علاوہ تمام اُمور ہوں گے۔

5 اپنے اپنے ایگزیکٹو اور مجلس قانون ساز کی مرضی سے ہر صوبہ اپنے اپنے گروپ کا انتخاب کرنے میں آزاد ہوگا جبکہ ہر گروپ میں صوبائی معاملات کے حوالے سے ہر صوبہ مشترکہ اُمور طے کرنے میں بھی آزاد ہوگا۔

6 انڈیا کو تین گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔گروپ بی میں متحدہ پنجاب، سندھ، سرحد ہوں گے۔گروپ سی میں متحدہ بنگال اور آسام جبکہ گروپ اے میں باقی تمام صوبے ہوں گے۔ان تینوں گروپوں اور ریاستوں کے نمائندے مل کر نیا آئین بنائیں گے۔

7 دس سال کے بعد صوبے اپنے گروپ بدلنے میں بھی آزاد ہوں گے۔

4 جون کو محمد علی جناح کے نام خط میں وائسرائے نے پھر سے یقین دلایا کہ اگر کسی ایک پارٹی نے بھی یہ منصوبہ مان لیا تو ہم اس پر عملدرآمد کروائیں گے۔[20]
6 جون1946ءکو مسلم لیگ نے کابینہ مشن منصوبہ کی منظوری دی۔

کمزور مرکز نامنظور

26 مئی کے ہریجن اخبار میں گاندھی جی نے کابینہ مشن پلان بارے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''ان حالات میں اس سے بہتر حل ممکن نہیں ہے''۔اسی دوران کانگرس کی صدارت ابوالکلام آزاد سے جواہر لعل نہرو کو منتقل ہوگئی۔جواہر لعل نہرو کو صدر بنوانے کے لیے مہاتما گاندھی نے کلیدی کردار ادا کیا۔صدارت سنبھالتے ہی پنڈت جواہر لعل نہرو نے اک ایسی پریس کانفرنس کی جس نے ہندوستان کو متحد رکھنے کی آخری کاوش کو نیست و نابود کر دیا۔نہرو نے کہا ''دفاع اور کمیونیکیشن جیسے شعبہ جات کو چلانے کے لیے بڑی سطح پر صنعتوں کا مرکزی کنٹرول میں ہونا ضروری ہے۔خارجہ اُمور میں بیرونی تجارت بھی شامل ہوتی ہے۔یونین کو چلانے کے لیے ٹیکس لگانے پڑتے ہیں، آخر مرکز صوبوں سے حاصل کردہ رقوم پر تو انحصار نہیں کر سکتا۔کرنسی اور کریڈٹ بھی مرکز کے پاس ہونے چاہئیں۔مرکز کے پاس

نہ صرف صوبوں کے درمیان ہونے والے تنازعات حل کرنے کا قانونی اختیار ہونا چاہیے بلکہ انتظامی یا معاشی بحران میں بھی مرکز کے پاس ہی تمام اختیارات ہونے چاہئیں۔[21] کانگرس ورکنگ کمیٹی کے سینئر رکن کانجی دوارکاداس اپنی کتاب ''آزادی کی طرف دس سال'' کے صفحہ 182 پر اس پریس کانفرنس بارے اپنا ردِعمل یوں دیتے ہیں۔

"This was one of the most fiery, provocative and uncalled for statements in his (Nehru) long public life".

مولانا آزاد نے بھی اپنی کتاب ''آزادی ہند'' میں کابینہ مشن بارے نہرو کے بیان کا شماران بدقسمت واقعات میں کیا جو تاریخ کا دھارا بدل دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا ''کیونکہ اور کوئی متبادل نہیں تھا اس لیے جناح نے اس منصوبہ کو قبول کرلیا جبکہ جواہرلعل کا بیان ایک بم کی طرح اس منصوبہ پر گرا''۔

صوبائی و قومیتی سیاستدانوں کی غفلت

اس بیان کے بعد قائداعظم نے بھی کابینہ مشن کی حمایت ترک کردی اور 28 جون کو اس مشن کے اراکین برطانیہ چلے گئے۔ کابینہ مشن پلان جہاں ہندوستان کو متحد رکھنے کا آخری موقعہ تھا وہیں صوبوں کو اختیارات دینے اور صوبائی خودمختاری کے حوالے سے بھی پہلا آئینی منصوبہ تھا جس میں کمزور مرکز کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ 16 مئی سے 28 جون 1946ء کے درمیان یعنی 43 دونوں میں اگر صوبائی قیادتیں اور قومیتی سیاست کے علمبردار اپنا وزن محمد علی جناح کے حق میں استعمال کرتے تو کانگرس کے لیے مضبوط مرکز کی حمایت اتنا آسان نہ رہتی۔ تاہم قومیتی سیاست کے علمبردار تو مضبوط مرکز کی حامی کانگرس کے ساتھ جڑے رہے اور ان کی اپنی کوئی آزاد سوچ نظر ہی نہ آئی۔

مولانا سندھی اور کمزور مرکز

یہ بات حقیقت ہے کہ سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے مولانا عبیداللہ سندھی (1944-1872) واحد شخصیت ہیں جنہوں نے 1939ء میں اک ایسا سیاسی منشور دیا تھا جس میں نہ صرف مذہبی، لسانی، قومیتی تنوع کو مدِنظر رکھا گیا تھا بلکہ عدم مرکزیت کی بات بھی وضاحت سے کی گئی تھی۔ ایک طرف مولانا نے ہندو مسلم مسئلہ کو سیاسی حوالے سے وحدت الوجود کے ذریعے حل کرنے کی تجویز رکھی تھی تو دوسری طرف قومیتی لسانی تنوع کو مانتے ہوئے کانگرسی قیادت سے کہا تھا کہ وہ ہندوستان کو ایک قوم قرار دینے کی غلطی نہ کریں۔[22] تاہم مضبوط مرکز کی حامی کانگرسی قیادت نے مولانا سندھی کی باتوں پر بوجوہ دھیان نہ دیا اور مہا قوم پرستی ہی میں غلطاں رہے۔

تقسیم ہند یا صوبوں کی تقسیم

کابینہ مشن مسترد ہونے کے بعد بنگال اور بہار میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتلِ عام نے گویا تمام راستے تقسیم ہند کی طرف موڑ دیئے۔ یوں اگر 1849ء سے 1947ء تک کی 98 سالہ تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات حقائق سے لگا کھاتی ہے کہ مضبوط مرکز کے حامیوں نے 3 جون 1947ء کے ماؤنٹ بیٹن پلان کو تو قبول کرلیا مگر صوبوں کو خودمختاری دینے کی عدم مرکزیت کی پالیسی کو نہ اپنایا۔ یہ ہماری سیاسی تاریخ کا وہ ''ملبہ'' ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت ہمیں ورثہ میں ملا۔ ہمارے ہاں سیاستدانوں، مورخین اور دانشوروں نے کبھی تو تقسیم ہند کی وجہ مذہبی منافرت کو قرار دیا تو کبھی اسے انگریز کی پھیلائی ہوئی ''گریٹ گیم'' کا شاخسانہ ٹھہرایا، ایسے بھی ''شیر'' تھے جنہوں نے یہ نعرہ لگادیا کہ جس دن ہندسندھ میں پہلا ہندو، مسلمان ہوا تھا پاکستان اسی دن بن گیا تھا۔ اقلیتی مسلم صوبوں کے رہنے

والوں نے بھی دعویٰ کر دیا کہ تحریکِ پاکستان کے وارث وہی ہیں۔ حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بالخصوص پنجاب اور بنگال جبکہ بالعموم سندھ اور سرحد پاکستان کے حق میں فیصلہ نہ کرتے تو سردار پٹیل جیسے لیڈر انہیں ایک انچ زمین بھی لینے نہ دیتے۔ تاہم تحریکِ پاکستان کے مؤرخین ومخالفین نے بوجوہ قیامِ پاکستان میں صوبوں کے کردار کو جان بوجھ کر کم تر دکھایا۔

کابینہ مشن کے برعکس ماؤنٹ بیٹن پلان کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان انہی صوبوں کو پہنچا جن پر مشتمل نیا ملک پاکستان تشکیل دیا گیا تھا۔ تقسیم بنگال کے نتیجہ میں، متحدہ بنگال کا پسماندہ ترین حصہ یعنی مشرقی بنگال پاکستان کو ملا کہ جس کی معیشت کا انحصار کلکتہ پر تھا۔ پنجاب کو تو ایسے تقسیم کیا گیا کہ اس کی نظیر شاید ہی دنیا میں کوئی دوسری ہو۔ مشرقی پنجاب سے مسلم پنجابیوں جبکہ مغربی پنجاب سے سکھ، ہندو پنجابیوں کا مکمل انخلاء معیشت ومعاشرت دونوں پر مہلک اثرات کا حامل تھا۔ لوگوں کے ساتھ ساتھ دریا بھی تقسیم ہوئے کہ جس نے عدم تحفظات کو خاصا بڑھایا۔ سندھ میں تقسیم کے بعد جب اُردو بولنے والے کراچی حیدرآباد پہنچے تو اس نے سندھیوں میں عدم تحفظ کو جنم دیا۔ سلہٹ کی طرح سرحد ریفرنڈم کے ذریعے پاکستان میں شامل ہو گیا مگر اس کے بعد یہاں خان عبدالغفار خان اور خان عبدالقیوم خان میں اقتدار کے حصول کی جنگ نے قبائلی مخاصمت کی شکل اختیار کر لی۔ آزادی ہند ایکٹ 1947ء کے تحت ریاستوں کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ آزاد رہ سکتی ہیں۔ انہیں دونوزائیدہ مملکتوں، بھارت و پاکستان میں سے کسی ایک کا انتخاب ہی کرنا تھا۔ تاہم وزیر اعظم برطانیہ **ایٹلی** نے جب نوآبادیاتی دور کے خاتمے کے حوالے سے 20 فروری 1947ء کو برطانوی پارلیمان میں تاریخی تقریر کی تو اس میں ریاستوں کے مستقبل کے حوالے سے مبہم الفاظ کی وجہ سے حیدرآباد (دکن)، کشمیر اور قلات جیسی ریاستوں نے ''آزاد'' رہنے کی کوششیں کیں مگر وہ بارآور نہ ہوئیں۔ البتہ جوناگڑھ نے پاکستان سے الحاق پر دستخط بھی کر دیئے مگر بھارت نے اس پر قبضہ کر لیا۔

قیامِ پاکستان اور تصورِ ریاست

پاکستان بننے کے بعد صوبائی خودمختاری، قومیتی مسائل اور علیحدگی پسندگی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ہمیں پس منظر اس لیے بھی بیان کرنا پڑا کہ عموماً جذبات کی رو میں بعض اہم اور فیصلہ کن واقعات بوجوہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

14-اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آنے والی دونوں ریاستیں بھارت و پاکستان، قومی ریاستوں یعنی Nation State کے قالب میں ڈھالی گئیں تھیں تاہم دونوں ریاستوں میں اس بارے کوئی اختلاف نہیں تھا کہ انہیں وفاقی قومی ریاستوں میں ڈھالنا ہوگا کہ جس کے لیے آئین سازی پہلا قدم ہے۔

پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس 11-اگست 1947ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے وضاحت سے اپنا تصور ریاست اراکین اسمبلی کے سامنے رکھا۔ قائداعظم نے بغیر لگی لپٹی کے یہ بات کہہ ڈالی کہ پاکستانی ریاست میں سب شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ کسی بھی پاکستانی کو کسی دوسرے پاکستانی پر بلحاظ مذہب، مسلک، رنگ، صوبہ، قومیت ترجیح نہیں دی جائے گی۔ تمام پاکستانی اپنی مذہبی، ثقافتی، لسانی، مسلکی شناختوں کو ساتھ لیتے ہوئے سیاسی حوالے سے پاکستانی قوم پرستی کی طرف بڑھیں گے۔ [23]

یہ پہلا موقعہ نہیں تھا جب قائداعظم نے ایسی باتیں کی ہوں۔ 1946ء میں دِلّی میں رائٹر کے نمائندے ڈان کیمبل سے گفتگو کرتے ہوئے محمد علی جناح نے کہا ''نئی ریاست اِک جدید جمہوری ریاست ہوگی کہ جس میں اقتدارِ اعلیٰ عوام کی ملکیت ہوگا۔ اس ریاست کے باسی بلا امتیاز مذہب، ذات اور نسل برابر کے شہری ہوں گے''۔ [24] 11-اگست ہی کے اجلاس میں مغربی پنجاب سے رُکن اسمبلی بیگم جہاں آراء شاہنواز نے قائداعظم محمد علی جناح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، آپ کو یاد ہی ہوگا کہ جب ہم مکمل صوبائی خودمختاری کے لیے لڑ رہے تھے اور اُس دور میں وہ بھی ناممکن لگتا تھا۔ آج تو ہم نے ایک الگ وطن حاصل کر لیا ہے۔ [25]

فروری 1948ء میں امریکی عوام کے نام ایک ریڈیو پیغام میں قائداعظم نے کہا ''پاکستان کا آئین، آئین ساز اسمبلی نے بنانا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ حتمی طور پر یہ کیسی آئینی دستاویز ہوگی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ جمہوری طرز کا آئین ہوگا کہ جس کو بنانے میں اسلام کے زریں اصولوں سے مدد لی جائے گی......................کسی بھی صورت میں پاکستان ایک ایسی مذہبی ریاست نہیں بنے گا جس میں کسی ماورائی مقصد کے حصول کے لیے پنڈتوں (ملاؤں) کا راج ہو''۔ [26]

صوبائی ولسانی حقوق کے حوالے سے قائداعظم کے تصورِ ریاست کی ایک مثال مارچ 1948ء میں ڈھاکہ میں کی گئیں ان کی تقاریر بھی ہیں کہ جہاں ریاست پاکستان کو پہلی دفعہ ''بنگالی زبان کے سوال'' سے کھلا واسطہ پڑا۔ ہماری تاریخ میں ان تقاریر کو اس قدر گمراہ کن انداز میں استعمال کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے محققین بھی غلطی کھا جاتے ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں کی گئی قائداعظم کی تقریر کے متعلق یہ بات پھیلائی گئی کہ انہوں نے اُردو کو قومی زبان قرار دے دیا تھا۔ اس تقریر سے غلط مطلب نکالنے والوں میں اُردو کے حمائیتی ومخالفین برابر کے شامل تھے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس تقریر میں اُردو کو محض رابطہ کی زبان (Langua-Franka) کہا گیا تھا۔ اس تقریر میں زبانوں سے متعلق ریاستی پالیسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قائداعظم نے واضح طور پر کہا، صوبائی اسمبلی، صوبہ میں جو بھی زبان ذریعہ تعلیم یا کاروو بہار کے لیے استعمال کرنا چاہے اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ [27] یہ بات دلچسپ ہے کہ قائداعظم 13 ماہ تک بطور گورنر جنرل پاکستان کا انتظام چلاتے رہے۔ انہوں نے ہر اہم مسئلہ پر اپنی پسند اور ناپسند کا اظہار کیا۔ ان تیرہ ماہ میں پاکستان کے کم از کم دو صوبوں یعنی مشرقی بنگال اور سندھ میں ذریعہ تعلیم کے لیے مادری زبان استعمال ہوتی رہی۔ قائداعظم نے کبھی بھی اسے پاکستان کے لیے خطرہ قرار نہ دیا۔

پہلے وفاقی وزیر تعلیم کا مادری زبانوں کے حق میں بیان

پاکستان بننے کے محض 45 دن بعد، کراچی میں پہلی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ملک بھر سے دانشوروں، ماہرین تعلیم اور اہم شخصیات نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے پاکستان کے پہلے وفاقی وزیر تعلیم اور بنگالی دانشور فضل الرحمٰن نے نہ صرف پاکستان میں بولی جانے والی مادری زبانوں میں پرائمری تک تعلیم دینے کے حق میں دلائل دیئے بلکہ یہ تک کہا کہ پاکستانی کلچر، پاکستان کے مختلف صوبوں میں بولی جانے والی زبانوں، ثقافتوں اور صوبوں کے تاریخی تسلسل کے ملاپ سے ہی بنے گا۔ [28] یہ تقریر اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ پاکستان کی پہلی کابینہ میں ایسے لوگ موجود تھے جو لسانی، ثقافتی وقومیتی تنوع پر یقین رکھتے تھے۔ شومئی قسمت، اسی وزیر کے خلاف کراچی میں جماعت اسلامی اور کمیونسٹ پارٹی نے ابتدائی سالوں میں مسلسل جلوس نکالے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ترقی پسندوں اور اسلامی بنیاد پرستوں کا حاوی حلقہ، اس دور میں لسانی، قومیتی وثقافتی تنوع کو بوجوہ ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا۔

آئین سازی: ابہام اور عملی مشکلات کے درمیان

کانگرس کی طرح مسلم لیگ بھی مختلف الخیال لوگوں کا ملغوبہ تھی۔ پاکستان بنانے پر تو سب متفق تھے مگر پاکستان کو کیسے چلایا جانا چاہیے اس بارے مختلف آراء موجود تھیں۔

☆ کچھ لوگ مضبوط مرکز کے حامی تھے اور پاکستان میں موجود صوبوں، قومیتوں، زبانوں اور ثقافتوں سے متعلق مطالبات کو بزور طاقت دبانے پر یقین رکھتے تھے۔ انہیں غلط فہمی تھی کہ یہ شناختیں پاکستانی قوم پرستی میں رکاوٹ ہیں۔

☆ کچھ لوگ پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کو ضروری گردانتے تھے اور پاکستان کو اپنی اپنی من پسند مسلکی تشریحات کے مطابق ''مثالی اسلامی ریاست''

بنانے بارے سوچتے تھے۔ ان سب کا جھکاؤ بھی مضبوط مرکز ہی کی طرف تھا۔ قراردادِ مقاصد کے حق میں مولانا مودودی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور سر ظفر اللہ خان کے اپنے اپنے مسلک کے مطابق دیئے گئے دلائل اس کا ثبوت ہیں۔ جبکہ راجہ صاحب محمود آباد اپنے مسلک کے مطابق ایسے ہی دلائل جناح صاحب کو 1946ء میں دے چکے تھے جنہیں جناح صاحب نے وفاقی جمہوری نظام کے مقابلہ میں مسترد کر دیا تھا۔

☆ کچھ لوگ تنوع کے اصول کو جمہوری طرزِ فکر کا جزو لاینفک سمجھتے تھے۔ ان کا استدلال تھا کہ مذہبی، قومیتی، لسانی تنوع اور صوبائی حقوق کو مانتے ہوئے مضبوط اور مستحکم پاکستان بن سکتا ہے۔

آئین ساز اسمبلی میں ہونے والی پہلے تین سالوں کی بحثوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف پاکستان مسلم لیگ بلکہ اس کے مخالفین میں بھی ان مسائل بارے ایک رائے نہیں تھی۔ بہت سے سیاستدان تو ردِعمل میں ایسے مطالبات کرنے لگے جن بارے ان کا اپنا ویژن بھی مفقود تھا۔ بقول سینئر سول سرونٹ تسنیم صدیقی، ابتدائی عہد کی مرکزی قیادت نے صوبوں میں من پسند سیاستدانوں کو آگے لانا شروع کیا جس کی وجہ سے صوبوں میں موجود مقبول عام قیادتوں میں ردِعمل بڑھتا گیا۔[29] پنجاب میں ممدوٹ، سرحد میں خان عبدالغفار خان اور خصوصاً مشرقی پاکستان میں حسین شہید سہروردی کو لیاقت علی سرکار نے بوجوہ تنگ کیا۔ حسین شہید سہروردی کو پہلے پاکستان داخل ہونے سے روکا گیا تو بعد ازاں لیاقت علی سرکار نے ان کی آئین ساز اسمبلی کی رکنیت بھی ختم کر ڈالی۔

لیاقت علی سرکار اور قراردادِ مقاصد

12 مارچ 1949ء کو بالآخر آئین کے اصول طے کرنے کے لیے کمیٹی بنائی گئی مگر اس وقت تک ''قراردادِ مقاصد'' لانے کی تیاری بھی مکمل ہو چکی تھی۔ قائداعظم کی وفات کے بعد آئین ساز اسمبلی کے تعزیتی اجلاس منعقدہ 14- دسمبر 1948ء میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی تقریر نئے بندوبست کی طرف واضح اشارے کر رہی تھی۔[30] قراردادِ مقاصد میں مولانا شبیر احمد عثمانی کے اہم کردار بارے آئین ساز اسمبلی کے اجلاس بتاریخ 22 دسمبر 1949ء میں بھی روشنی ڈالی گئی۔ یہ اجلاس مولانا کی وفات مورخہ 13 دسمبر 1949ء کے بعد ہوا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا مودودی کی قراردادِ مقاصد کی تشکیل میں معاونت بارے اپنے حالیہ کالم میں قاضی حسین احمد، سابق امیر جماعت اسلامی نے بھی اقرار کیا ہے۔[31] قراردادِ مقاصد کے ذریعے نوزائیدہ مملکت میں گورنینس، فنانس اور صوبہ۔ مرکز تعلقات جیسے اہم معاملات سے پہلوتہی کے لیے اسلام اور غیر اسلام یعنی سیکولرازم کی بحث ایسے چلائی گئی کہ صوبائی خودمختاری سمیت دیگر اہم مسائل پس پشت چلے گئے۔ قراردادِ مقاصد کے حق میں وزیراعظم خان لیاقت علی خان کے علاوہ وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان اور سردار عبدالرب نشتر سمیت بہت سے لوگوں نے پُرزور دلائل دیئے جبکہ قرارداد کی مخالفت میں اقلیتی ممبران آئین ساز اسمبلی نے زوردار تقاریر فرمائیں۔[32] لاہور کے میاں افتخار الدین آئین ساز اسمبلی میں واحد آواز تھے جنہوں نے قراردادِ مقاصد کی مخالفت کرتے ہوئے حکومتی و اقلیتی اراکین کو کہا کہ وہ اسے اسلام اور سیکولرازم کی لڑائی ہرگز نہ بننے دیں بلکہ ''حقوق'' کی لڑائی کے اردگرد ترتیب دیں۔[33] میاں صاحب کا استدلال تھا کہ فیصلہ اس بات پر ہونا چاہیے کہ کیا مذہبی اقلیتیں پاکستان میں برابر کے شہری حقوق رکھتی ہیں یا نہیں۔ ریاست عام آدمی کے حقوق کا تحفظ کیسے کرے گی وغیرہ۔ تاہم میاں صاحب کی بات پر نہ تو حکومتی اراکین اسمبلی نے دھیان دیا نہ ہی ان کے دلائل پر اقلیتی ارکان اسمبلی نے غور کیا۔ دوسری طرف جی ڈبلیو چوہدری کے بقول پاکستان میں ابتدائی زمانہ میں اس بات کو اکثریتی رائے سے طے کر لیا گیا کہ آئین کو اسلامی ہونا چاہیے مگر ''اسلامی ریاست'' کے سوال پر قراردادِ مقاصد پر دستخط کرنے والوں میں بھی شدید اختلافات رہے۔[34]

یادرہے، متحدہ بنگال کے آخری وزیراعظم اور مشرقی پاکستان کے ہردلعزیز رہنما حسین شہید سہروردی کو آئین ساز اسمبلی سے نکالنے کا فیصلہ 12 مارچ 1949ء کو ہی کیا گیا جب سہروردی اسمبلی میں موجود تھے۔[35] سہروردی نے اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے لیاقت علی سرکار پر پھبتی کسی ''اپنے تدفین کے موقعہ پر خطاب کرنے کا موقعہ کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے''۔[36]

بات قراردادِ مقاصد پر رُکی نہیں بلکہ اگست 1949ء میں لیاقت علی سرکار نے پروڈا[37] جیسا قانون بناڈالا کہ جس کے اولین شکاروں میں ایک وزیراعلیٰ پنجاب میاں افتخار حسین ممدوٹ بھی تھے۔ 1950ء میں نہ صرف پنجاب حکومت توڑ دی گئی بلکہ افتخار حسین ممدوٹ پر کیس چلاتے ہوئے لیاقت علی خان نے ممتاز دولتانہ سے مضبوط رشتے استوار کیئے ممدوٹ کا کیس لڑنے سہروردی لاہور چلے آئے اور یوں مرکزی و صوبائی حکومتوں سے نکلنے والوں میں اتحاد بننے لگا۔ سینئر سول سرونٹ تسنیم صدیقی تو برملا، پاکستان کے قوم پرست رہنماؤں بارے یہ رائے رکھتے ہیں۔ ''یہ قوم پرست رہنما نہیں تھے بلکہ جب انہیں قومی دھارے سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو ردِ عمل میں یہ رہنما قوم پرست بن گئے''۔[38]

مخالفوں کا اتحاد

جب حکمرانوں کے دباؤ کے تحت عدالتوں میں سہروردی کو بطور وکیل رجسٹر ہونے سے روکا گیا تو یہ اعزاز پنجاب میں ساہیوال کو حاصل ہوا کہ جہاں سہروردی بطور وکیل رجسٹر ہوئے۔ بقول بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ، پھر حسین شہید نے عوامی لیگ بنالی کہ جس کا پہلا جلسہ 20 مارچ 1950ء کو لاہور کے تاریخی موچی دروازہ میں کیا۔ مولانا عبدالستار نیازی ان کے جنرل سیکریٹری تھے۔ سرحد میں اس پارٹی کے صدر پیر آف مانکی شریف تھے۔ بعدازاں ممدوٹ کی جناح مسلم لیگ کے ساتھ عوامی لیگ کا ادغام ہوا۔ یوں آل پاکستان جناح عوامی مسلم لیگ بنائی گئی۔ ایک طرف مضبوط مرکز کے حامی قراردادِ مقاصد، پروڈا، اسلام اور اُردو کے ذریعے غیر لچکدار پالیسی پر گامزن تھے تو دوسری طرف افتخار حسین ممدوٹ، حسین شہید سہروردی اور میاں افتخار الدین کے دیگر غیر مسلم لیگی رہنماؤں سے سیاسی رشتے بننے لگے۔ ان سب میں قدر مشترک مرکزی حکومت کی مخالفت ٹھہری۔

مضبوط مرکز کی پہلی شکست مگر............

اسی دوران 1951ء سے 1954ء کے درمیان بالغ رائے دہی کی بنیاد پر صوبائی انتخابات کا ڈول ڈالا گیا۔ مارچ 1951ء میں پنجاب، دسمبر 1951ء میں سرحد، مئی 1953ء میں سندھ جبکہ اپریل 1954ء میں مشرقی پاکستان میں انتخابات ہوئے۔ 1951ء میں پنجاب میں انتخابات کے بعد ووٹروں نے پہلی دفعہ ''جھرلو'' کی اصطلاح سنی۔ مغربی پاکستان میں تو مرکزی سرکار نے دھاندلیوں سے فتح حاصل کر لی مگر مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ (United Front) نے ایسا نہ ہونے دیا۔ جگتو فرنٹ میں عوامی لیگ کے علاوہ اے کے فضل الحق کی کرشک سرامک پارٹی، گناتنتزی دَل اور نظام اسلام پارٹی شامل تھے۔ مرکزی حکومت کی زیادتیوں اور مداخلتوں بارے تو ان سب پارٹیوں کا موَقف ایک تھا مگر خود اقتدار میں آکر کیا کرنا ہے اس بارے ان میں شدید اختلافات پائے جاتے تھے۔ بہت کچھ تو ان پارٹیوں کے ناموں سے ہی عیاں ہوتا تھا پھر رہی سہی کسر صوبائی اقتدار میں داخل ہوتے ہی نکل گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ 1954ء کے انتخابی نتائج جگتو فرنٹ کی کامیابی سے زیادہ مسلم لیگ کی ناکامی کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ یہ مضبوط مرکز کے حامیوں کی پہلی شکست تھی۔ کراچی کے سیٹھوں اصفہانی اور آدم جی نے پٹ سن کے حوالے سے جو کارخانے مشرقی پاکستان میں لگا رکھے تھے اس پر بنگالیوں کو شدید تحفظات تھے۔ وہ سرِ عام یہ کہتے تھے ''ہمیں کراچی کی سڑکوں سے پٹ سن کی بُو آتی ہے''۔[39] قوم پرستی کے جذبات کو بڑھاوا دے کر مسلم لیگ کو تو شکست دے ڈالی مگر متبادل حکومت کا ویژن نہ ہونے کے کارن یہ فتح جلد ہی بے توقیر ہوگئی۔

بھارت میں لسانی مسئلہ کا حل

پاکستان کے ہمراہ آزاد ہونے والے ملک بھارت میں بھی ایسے ہی مسائل تھے۔ بھارتی قوم پرستی کے نام پر زبانوں اور قومیتوں کو دبانے اور مضبوط مرکز کا نعرہ لگانے والے وہاں بھی کم نہ تھے۔ مگر ایک حد تک وہاں حالات کو بگڑنے سے بچا لیا گیا۔ 17 جون 1948ء کو قومیتی سیاست کے علمبرداروں اور وفاقی بھارتی سرکار نے باہم مل کر ''ڈار کمیشن'' بنوایا۔ اس کمیشن نے آئین ساز اسمبلی کو بتایا کہ بھارت میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ریاست نے یہ تسلیم کیا کہ یہ 26 زبانیں بھارت کی وفاقیت کی علامت ہیں اور ان میں تعلیم حاصل کرنا ہر ایک کا حق۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں زبان کی تحریک کو وفاقیت سے متصادم قرار دے دیا گیا۔

بنگالی زبان کی تحریک: ایک غلط فہمی

بنگالیوں نے زبان کی تحریک ایسے اُساری کہ جیسے وہ اُردو کے مقابلے میں بنگالی زبان کو بھی تخت نشینی دلانا چاہتے ہوں۔ اگر وہ اس تحریک کو لسانی تنوع کو تسلیم کرنے کے ارد گرد ترتیب دیتے اور یہ کہتے کہ پاکستان کی تمام مادری زبانوں کو تسلیم کیا جائے تو ایک دیرینہ مسئلہ حل ہونے کی طرف بڑھتا۔ 1952ء میں دادا فیروز الدین منصور نے ایک مضمون میں اس طرف واضح اشارے بھی کیے (یہ مضمون کتابچہ کی شکل میں ''سچیت کتاب'' گھر لاہور نے حال ہی میں دوبارہ چھاپ دیا ہے) تاہم قومیتی ولسانی سیاست کے علمبردار بشمول دادا فیروز الدین منصور کی اپنی جماعت کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان بوجوہ قومیتی، ثقافتی ولسانی تنوع کی تحریک کو پورے ملک میں اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جگتو فرنٹ کے مطالبوں میں بھی محض بنگالی کو قومی زبان بنانے کی بات کی گئی۔ 1971ء کے بعد جب شیخ مجیب نے غیر بنگالیوں بالخصوص چکما و دیگر قبائل کو بھی بنگالی زبان و ثقافت اپنانے کی تلقین کی تو تنوع کے اصول کو جمہوری طرز فکر کا جزو لاینفک سمجھنے والے بہت سے بنگالیوں کو دھچکا لگا۔[40] مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ جو جنگ وہ جیت چکے تھے اس میں ''تنوع'' کے اصول کو ملحوظِ خاطر نہیں رکھا گیا تھا۔

آئینی فارمولے اور صوبائی حقوق

آئین کے بنیادی اصول وضع کرنے والی کمیٹی نے 1954ء تک دو اہم رپورٹیں پیش کیں۔ 1950ء میں آنے والی پہلی رپورٹ میں یہ اہم نکات تھے۔

1- قراردادِ مقاصد کو آئین میں ریاستی پالیسی کے منبع کی حیثیت حاصل ہوگی تاہم یہ بنیادی حقوق سے متصادم نہیں ہوگی۔
2- سربراہ مملکت کو دونوں ایوان مل کر پانچ سال کے لیے چنیں گے۔ کوئی بھی دو بار سے زیادہ عرصہ کے لیے سربراہ نہیں بن سکتا۔
3- سربراہ مملکت وزیر اعظم کا انتخاب کرے گا جسے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس سے اعتماد کا ووٹ لینا ہوگا۔ وزیر اعلیٰ کا انتخاب وزیر اعظم کے مشورے سے ہوگا۔
4- ایک ایوان یونٹوں پر مشتمل ہوگا جبکہ دوسرا عوامی نمائندگان پر۔ موجودہ یونٹوں میں بلوچستان کا اضافہ کیا جائے گا۔
5- دونوں ایوانوں کی حیثیت مساوی ہوگی۔ تنازعہ کی صورت میں مشترکہ اجلاس بلایا جائے گا۔
6- اسمبلی کو وزیر اعظم کے مشورے سے ختم کیا جا سکے گا۔
7- اُردو ریاست کی سرکاری زبان ہوگی۔

اس رپورٹ کے خلاف بقول حامد خاں ایڈووکیٹ مشرقی پاکستان میں خاصا ردِعمل ہوا۔[41] حیران کن اَمر یہ ہے کہ بنگال والوں کو ہاؤس آف یونٹ پر اعتراض

تھا کہ اس میں تمام صوبوں کو کیوں برابر کی نمائندگی دی گئی ہے۔ انہیں وہم تھا کہ اس بندوبست کے ذریعے اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا جائے گا۔[42] 21 نومبر کو لیاقت علی خان نے اس رپورٹ کو واپس لے لیا اور دوسری رپورٹ تیار کرنے کو کہا۔ 22 دسمبر 1952ء کو دوسری رپورٹ جب پیش ہو رہی تھی تو خواجہ ناظم الدین وزیراعظم تھے اور لیاقت علی قتل ہو چکے تھے۔ رپورٹ میں اہم باتیں یہ تھیں۔

-1 قراردادِ مقاصد کو دیباچہ کے طور پر شامل کیا جائے گا۔

-2 سربراہ مملکت کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ علاوہ ازیں سربراہ مملکت اور وزیراعظم کے حوالے سے پہلے رپورٹ کی سفارشات کو برقرار رہنے دیا۔

-3 ہاؤس آف یونٹس میں 120 ممبران ہوں گے۔ 60 مشرقی پاکستان کے جبکہ باقی 60 باقی یونٹوں کے۔ عوامی ایوان نمائندگان میں 400 ممبران ہوں گے۔ 200 مشرقی پاکستان سے جبکہ 200 مغربی پاکستان سے۔

-4 ایوان عوامی نمائندگان کو اصل طاقت حاصل ہوگی۔

-5 سول سرونٹس کو آئینی تحفظ حاصل ہوگا۔

-6 سربراہ مملکت کو زیادہ اختیارات حاصل ہوں گے۔

-7 صوبوں کے علاوہ قبائلی علاقہ جات، ریاستوں اور دارالحکومت سب کو الگ یونٹ کہا گیا۔

اس ڈرافٹ پر بھی تنقید دیکھنے میں آئی۔ یہ کہا گیا کہ عملاً اکثریتی صوبہ کو غیر ضروری طاقت دے دی گئی ہے۔ صوبوں اور دیگر یونٹوں کو ملا کر کل 9 یونٹ بنائے گئے ہیں۔ یوں عملاً صوبوں کی طاقت کو محدود کر دیا گیا۔ دوسری طرف سربراہ مملکت کو زیادہ اختیارات اور سول سرونٹس کو آئینی تحفظ دینے سے مرکز کی طاقت میں اضافہ ہوگا۔

گو کہ دونوں رپورٹیں اپنا مقصد حاصل نہ کر سکیں تاہم ان رپورٹوں میں بہت سے اُمور طے بھی ہو گئے۔ 6 اکتوبر 1954ء کو قانون ساز اسمبلی میں ایک اور فارمولا زیرِ بحث آیا جسے عرفِ عام میں محمد علی[43] فارمولا کہتے ہیں۔ اس وقت محمد علی بوگرہ وزیراعظم پاکستان تھے جبکہ غلام محمد گورنر جنرل۔ فارمولا کے اہم نقاط یہ تھے۔

☆ یونٹوں کی تعداد 9 سے 5 کر دی گئی اور پانچویں یونٹ میں بلوچستان، بلوچستانی ریاستیں، دارالحکومت اور بہاولپور ریاست کو شامل کیا گیا۔

☆ ہاؤس آف یونٹ کو یونٹوں کی اسمبلیوں نے منتخب کرنا تھا۔

☆ ایوان عوامی نمائندگان 300 ممبران پر مشتمل قرار پایا جس میں مشرقی بنگال کے لیے 165 سیٹیں رکھیں گئیں۔

☆ دونوں ایوانوں کو برابر کے اختیارات دیئے گئے۔ سربراہ مملکت کو مشترکہ اجلاس میں منتخب کرنا ضروری تھا جبکہ عدم اعتماد میں بھی مشترکہ اجلاس ہی بلانا لازم تھا۔

ایک نئی شرط البتہ ایسی شامل کی گئی جو دونوں اطراف کے تحفظات دور کرنے کے لیے معاون رہی۔ اس شرط کے مطابق مشترکہ اجلاس میں ہر فیصلہ اکثریتی رائے سے تو ہونا طے پایا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس فیصلہ کو مشرقی اور مغربی پاکستان سے 30 فیصدی حمایت ملنی بھی ضروری تھی۔ اسمبلی میں فارمولا پر بحث ہوئی اور کچھ اہم ترامیم بھی کی گئیں۔

پہلی آئین ساز اسمبلی کی موت

مضبوط مرکز کے حامیوں نے محمد علی فارمولا کو صوبوں کے حق میں دستاویز قرار دیتے ہوئے اس بارے شدید تحفظات کا اظہار کیا۔ ایسے دلائل دینے والوں

میں اے کے بروہی بھی شامل تھے۔[44] اکثریتی مسلم صوبوں کے پرانے مسلم لیگی اس بات پر حیران تھے کہ وہ قبل از تقسیم صوبائی خودمختاری کی حمایت کرتے تھے تو بعداز تقسیم صوبائی خودمختاری کیوں ''مُر دار'' ٹھہری۔ بلا آخر جب 1954ء میں نئے آئین کا ڈرافٹ تیار ہوا تو اس میں 1935ء کے آئین کی مانند تین فہرستیں بنائی گئیں یعنی وفاقی، صوبائی اور درمیانی (Concurrent)۔ باقی ماندہ شعبہ جات بھی مرکز ہی کو دے دیئے گئے۔ مئی 1954ء میں پیش کردہ تجاویز میں بنگالی زبان کو اُردو کے ساتھ تخت نشینی بھی دے دی گئی۔ ان تمام تجاویز کے ساتھ دوسرا ڈرافٹ 6 اکتوبر 1954ء کو آئین ساز اسمبلی نے منظور کر لیا۔ جب آئین ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کے اسمبلی توڑنے کے اختیار کو ختم کرنے کی قرارداد منظور کی تو پھر 24 اکتوبر 1954ء کو گورنر جنرل نے پہلی آئین ساز اسمبلی ہی توڑ ڈالی۔

دوسری آئین ساز اسمبلی، ون یونٹ اور نئے کھلاڑیوں کا مقام

دوسری آئین ساز اسمبلی بننے سے قبل گورنر جنرل غلام محمد نے وزیراعظم بوگرہ کی قیادت میں جو حکومت بنائی اس کی کابینہ میں کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خان بحیثیت وزیرِ دفاع براجمان تھے۔ یوں صوبے، مرکز سے اپنے اختیارات تو نہ لے سکے البتہ مرکز میں اک نئے طاقتور کھلاڑی کا اضافہ ہو گیا جو مضبوط مرکز کے فلسفہ کا منطقی نتیجہ تھا۔ جہاں عوام کی طاقت اور صوبوں کو حقوق دیتے ہوئے قومی یکجہتی کی بنیادیں رکھنے سے پہلوتہی کی جائے گی وہاں ریاستی طاقت پر انحصار بڑھنا لازمی تھا کہ جس کا سب سے بڑا مظہر عسکری قیادت تھی۔

10 مئی 1955ء کو دوسری آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کیا گیا۔ اکتوبر 1955ء میں وَن یونٹ کا بل اسی اسمبلی نے منظور کیا۔ یاد رہے، پیرٹی کا فارمولا جگتو فرنٹ نے بھی قبول کیا۔[45] حسین شہید سہروردی اس حکومت کے وزیر قانون تھے۔ 8 نومبر 1955ء کو سندھ میں پیرزادہ عبدالستار کی حکومت توڑنے کے بعد کھوڑو کو مسندِ اقتدار دیا گیا۔ بعدازاں نومبر ہی کے مہینے میں سندھ، سرحد اور پنجاب کی اسمبلیوں، بلوچستان کے شاہی جرگہ اور قلات نے وَن یونٹ کے حق میں قراردادیں منظور کیں۔ جگتو فرنٹ اور مسلم لیگ نے مل کر 8 جنوری 1956ء کو نیا آئین دے ڈالا۔ عوامی لیگ نے اس مسودہ کی مخالفت کی اور کہا کہ جگتو فرنٹ والے مرکزی اقتدار میں آتے ہی اُس 20 نکاتی ایجنڈے کو بھول گئے ہیں جس کے تحت انہوں نے مسلم لیگ کو شکست فاش دی تھی۔ سب سے اہم مطالبہ مرکز کو تین شعبہ جات دینے اور باقی تمام اختیارات صوبوں کو تفویض کرنے والا تھا جسے بقول عوامی لیگ، اے کے فضل حق بھول چکے ہیں۔

مشہور ایڈووکیٹ حامد خان کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ عوامی لیگ بھی اس سمجھوتے کو قبول کر سکتی تھی مگر جب اسے اقتدار کی جتھہ بندی میں جگہ نہ دی گئی تو اس نے زیادہ سخت مؤقف اپنا لیا۔ اسی سال کے آخر میں سہروردی نے اُسی آئین کے تحت حلف اٹھایا اور دس ماہ تک وزارتِ عظمٰی میں رہے۔

1956ء کا آئین اور صوبوں کے حقوق سے مراجعت

1956ء کے آئین کے تحت پاکستان کو پہلی دفعہ اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا۔ بنگال کو اُردو کے ساتھ تخت نشینی دے دی گئی۔ بالغ رائے دہی کے تحت قومی انتخابات کروانے کے علاوہ وفاقی اکائیوں پر مشتمل ایوان ختم کر دیا گیا۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ 1935ء سے 1956ء کے درمیان جتنے بھی آئینی فارمولے آئے، ماسوائے کابینہ مشن کے، تمام تجاویز میں مالیات اور اثاثہ جات کے تقسیم کے حوالے سے جھکاؤ مرکز ہی کی طرف رہا۔

مرکز گریز قوتوں میں انتشار

سہروردی کی وزارتِ عظمٰی کے دوران، سامراج کی حمایت کا الزام لگاتے ہوئے مولانا بھاشانی سمیت مغربی پاکستان کے بہت سے رہنما عوامی لیگ سے الگ

ہوگئے۔ بعدازاں مغربی پاکستان کے ترقی پسندوں وقوم پرستوں کے ساتھ مل کرانہوں نے جولائی 1957ء میں نیشنل عوامی پارٹی بنائی۔ یوں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صوبائی خودمختاری اور قومیتی حقوق کے علمبردار 1954ء میں جگتو فرنٹ کی فتح سے نیپ کے قیام تک سمجھوتوں اور منقسم ہونے کے عمل سے گزرے۔ باامر مجبوری سہروردی اور ریپبلکن پارٹی کی کمزور ہوتی ہوئی سرکار نے اعتماد کا ووٹ لینے کے لیے نیشنل عوامی پارٹی سے ستمبر 1957ء میں سمجھوتہ کرلیا۔ سہروردی نے وَن یونٹ کے خاتمے اور لسانی قومیتی بنیادوں پر خودمختار اکائیوں پر مشتمل وفاق کے لیے آمادگی ظاہر کی جبکہ نیشنل عوامی پارٹی نے سہروردی کو اعتماد کا ووٹ دینا تھا۔ 17 ستمبر 1957ء کو مغربی پاکستان اسمبلی نے وَن یونٹ کے خلاف بھاری اکثریت سے قرارداد منظور کی۔ سکندر مرزا نے یہ سب کچھ اس لیے بھی ہونے دیا کہ یوں وہ ''طاقت کے مراکز'' کے روبرو مقبول عام سہروردی کو ''انتہاپسند'' ثابت کرسکتے تھے۔ دوسری طرف کراچی کے کاروباری حلقے سہروردی کے اس وقت سے خلاف ہو چکے تھے جب سے سہروردی نے 10 ملین ڈالر کی آئی سی اے[46] کی امداد کا بڑا حصہ مشرقی پاکستان میں لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔[47] یوں اکتوبر 1957ء میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے میں دشواریوں کے پیش نظر حسین شہید سہروردی نے استعفیٰ دے ڈالا۔ انقلابی نیپ نے سہروردی کو ڈبونے میں پورا حصہ ڈالا کہ جس کے بعد ''ماڑا موٹا'' جمہوری بندوبست تیزی سے منطقی انجام کی طرف بڑھا۔

سہروردی کے بعد دو ماہ کے لیے آئی آئی چندریگر کی وزارت بنی۔ یوں لگتا ہے کہ یہ وزارت تو محض ان 10 ملین ڈالر والے فیصلہ کو بدلنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد فیروز خان نون نے وزارتِ عظمیٰ سنبھالی تو اس میں انقلابی نیپ کے علاوہ کرشک سرمک پارٹی، عوامی لیگ، نیشنل کانگرس اور شیڈول کاسٹ فیڈریشن شامل تھے۔ مگر صوبائی خودمختاری، صوبہ مرکز تعلقات اور قومیتی ولسانی تنوع کے حوالے سے کوئی بات آگے نہ بڑھ سکی۔ اگر ایوب خان سے قبل کے دور کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یوں لگتا ہے کہ کچھ گروہ اسلام اور اُردو کے نام پر مرکز پر حاوی ہونا چاہتے تھے تو کچھ قومیتی، لسانی سوال اور صوبائی خودمختاری کے نام پر مرکز تک پہنچنا چاہتے تھے۔ صوبائی خودمختاری کے حمایتی جونہی مرکز میں براجمان ہوجاتے تو ان کے خیالات میں ''وسعت'' آجاتی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ مختلف قوتوں کا ''غبار'' مرکز میں پہنچ کر نکلتا رہتا تھا مگر جب 1958ء کے مارشل لاء نے قدم رنجا فرمایا تو گویا اس ماڑے موٹے سیاسی عمل پر بھی ''ڈکا'' لگ گیا۔ صوبہ مرکز تعلقات کی بجائے پاکستان میں مارشل لاء اور جمہوری نظام کی جنگ شروع ہوگئی۔

پہلا مارشل لاء............نئی مصیبت

ایوب خان کے مارشل لاء کو جن باتوں کی وجہ سے یاد رکھا جاتا ہے ان میں اجارہ دار صدارتی بندوبست، مقامی حکومتوں کے نظام کے ذریعے صوبوں کو کمزور کرتے ہوئے نئی من پسند سیاسی قیادت پیدا کرنے کے جتن، شریف کمیشن رپورٹ 1959ء، حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ 1966ء، صنعتی ترقی، 1965ء کی جنگ اور بعدازاں تاشقند پاک بھارت سرد جنگ کی ابتداء اہم ہیں۔ ایوب خان کی حکومت نے آتے ہی بنیادی جمہوریتوں کا نظام متعارف کروایا۔ بلدیاتی نظام کی ضرورت سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا مگر جس نیت سے اس کو شروع کیا گیا وہی اس نظام کی پائیداری میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔

کسی بھی وفاقی جمہوری بندوبست میں محض وفاقی اور صوبائی ایوانوں سے کام نہیں چلتا۔ ''دوسطحوں (وفاقی وصوبائی) کی فیڈریشن مختلف طرح کے علاقائی (قومیتی، لسانی، قبائلی وغیرہ) مسائل سے نمٹنے کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ صوبوں یا ریاستوں کے نیچے بھی ایک سطح ہوتی ہے (اسے ضلع کہا جاتا ہے) کہ جسے آئینی تحفظ دینے کے بعد علاقائی مسائل سے نبرد آزما ہوا جاسکتا ہے''۔[48]

بدقسمتی سے پاکستان میں اس تیسری اہم ترین سطح کو مثبت طریقے سے لوگوں کے روزمرہ مسائل حل کرنے کے لیے استعمال نہیں کیا گیا۔ پاکستان بننے کے بعد ابتدائی سالوں میں تو بلدیاتی انتخابات، محدود شرائط کے ساتھ کروائے گئے تاہم جلد ہی اس تسلسل کو ختم کردیا گیا۔ ایوب خان نے بلدیاتی

انتخابات کو دوبارہ سے جاری تو کیا مگر درحقیقت، اس تیسری سطح کو محض اپنے سیاسی دوام کے لیے استعمال کیا۔ بدقسمتی سے ملک پاکستان میں مذہب، قوم پرستی اور لسانی حقوق کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ مقامی حکومتوں کے بندوبست کو بھی حذب اختلاف وحذب اقتدار نے محض اپنے مقاصد کی بھینٹ چڑھا دیا۔

صدارتی نظام۔ وفاقی پارلیمانی بندوبست سے مراجعت

ایوب خان نے 17 فروری 1960ء کو جسٹس صبیح الدین کی چیئرمینی میں آئینی کمیشن بنایا کہ جسے پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کی ناکامیوں کا جائزہ لینا تھا۔ کمیشن نے سیاستدانوں کو تمام ترخرابیوں کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے ایوبی مارشل لاء کو جواز فراہم کرنے کے علاوہ کوئی بڑا تیر نہیں مارا۔ البتہ کمیشن نے یہ لکھنے کی جرأت بھی کی کہ مرکزی حکومت کی صوبائی معاملات میں مداخلتوں نے بھی جمہوری عمل کو سبوتاژ کیا۔ یہ کمیشن تو صدارتی نظام کو متعارف کروانے کا دیباچہ ہی تھا۔ البتہ صدارتی نظام کے جواز کے لیے کمیشن نے سیاستدانوں کو سیاسی جماعتوں کے ڈھانچوں میں جمہوریت لانے کا جو مشورہ دیا تھا اُسے سیاستدان اگر ''زحمت میں رحمت'' کے پیرائے میں دیکھ لیتے تو عوامی حقوق کی جدوجہد کو نئے راستے مل سکتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند، قوم پرست، مذہبی یا رواجی سیاسی جماعتوں کے اندر جمہوریت نام کو بھی نہیں تھی۔ عام لوگوں کا سیاسی رہنماؤں پر اعتبار ابھی کم نہیں ہوا تھا مگر عام سیاسی کارکنوں کو فیصلہ سازی میں شامل کرنے کے حوالے سے سیاسی جماعتوں کی کارکردگی قطعاً قابلِ تحسین نہیں تھی۔ عوامی سطح پر شخصیت پرستی اور جذباتیت کو خاص مقام حاصل تھا۔ مگر کمیشن کس منہ سے سیاستدانوں کو یہ باتیں کہہ سکتا تھا کہ حکومت تو خود سیاسی اداروں کے بننے میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہی تھی۔ جس ملک میں مقننہ، عدلیہ، الیکشن کمیشن جیسے ادارے نہ بننے دیئے گئے ہوں، انتظامیہ جانبداری کے مظاہرے کرے وہاں محض سیاستدانوں کو موردِالزام ٹھہرانا درست نہیں۔ البتہ عوامی نقطہ نظر سے فوجی حکومتوں اور سیاستدانوں، دونوں ہی کا قبلہ درست نہیں تھا۔ ایوب خان نے تو سیاسی مخالفین کو ''نکرے'' لگانے کے لیے لیاقت علی خان کے ''پروڈا'' کی طرح ''ایبڈو'' جیسے قانون کا سہارا لے رکھا تھا۔ کمیشن نے 6 مئی 1961ء کو اپنی رپورٹ جنرل ایوب خان کو پیش کر دی۔[49] ایوب خان نے کابینہ کے مشورے سے رپورٹ کی کچھ باتیں مان لیں اور یوں 1962ء کے آئین کا مسودہ تیار ہوا۔ مضبوط مرکز کے حامیوں کے نزدیک یہ آئینی مسودہ ایک بہترین نمونہ تھا مگر اس میں انہیں عسکری قیادت کی ماتحتی میں ہی کام چلانا تھا۔ 1962ء کے آئین میں بھی مرکز کو صوبوں پر ہر طرح سے فوقیت دی گئی۔ 1956ء کے آئین کی طرح جب سینٹ بھی نہیں بنائی گئی تو صوبوں کی نمائندگی مزید کا کم ہونا لازم تھا۔ مالیاتی اثاثہ جات کے حوالے سے تو صوبوں کو 1935ء کے ایکٹ والے اختیارات بھی نہیں دیئے گئے تھے۔ یاد رہے، 1947ء کے بعد 1935ء کے ایکٹ میں مزید ایسی تبدیلیاں کی گئیں تھیں کہ مالیاتی اثاثہ جات پر ''کراچی'' کا کنٹرول مزید زیادہ ہو گیا تھا۔ صوبوں کے ساتھ انکم ٹیکس سے اکٹھی ہونے والی رقوم میں حصہ داری کی روایت بھی ختم کر دی گئی تھی۔[50] صوبوں اور مرکز میں اثاثہ جات اور محاصل کی تقسیم بارے قومی معاشی کونسل اور قومی مالیاتی کمیشن جیسے ادارے تو بننے لگے تھے مگر نہ تو ان کی کارکردگی بارے میڈیا اور عام لوگوں کو پتہ چلتا تھا نہ ہی ابھی ان کی کارکردگی کو سیاست میں جگہ ملی تھی۔ جنوری 1965ء میں ایوب خان نے مادرِملت فاطمہ جناح کو صدارتی انتخابات میں ہرا دیا۔ اگر انتخابی نتائج کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے (جو بہت مشکل ہے) تب بھی ڈھاکہ، چٹا گانگ اور کراچی ڈویژنوں میں ایوب خان کی شکست کی وجہ مشرقی پاکستان کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک اور دارالحکومت کی کراچی سے اسلام آباد منتقلی تھی۔ ایوب خان کے اپنے بنائے ہوئے بی ڈی ممبروں کے نظام میں تقریباً 38 فیصد کونسلروں نے پورے ملک میں ان کے خلاف مادرِملت کو ووٹ ڈالا جو ایوب خان کی مقبولیت کا راز فاش کرنے کا زندہ ثبوت تھا۔

لسانی قومیتی مسئلہ کا منفی استعمال

صدارتی الیکشن کے بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ جس نے کراچی ہی نہیں بلکہ بعدازاں مغربی پاکستان میں لسانی وقومیتی سیاست کو منفی انداز میں مزید سر اٹھانے کی راہ دکھائی۔

یہ 4 جنوری 1965ء کی بات ہے جب ایوب خان کے فرزند کیپٹن (ر) گوہر ایوب خان نے کراچی میں اپنے والد کی فتح کے جشن میں جلوس نکالا۔ یہ تاثر دیا گیا کہ ایوب خان کو پٹھان (ترین) ہونے کی وجہ سے کراچی کے اُردو بولنے والوں نے ووٹ نہیں دیئے۔ اسی رات کو اُردو بولنے والے مہاجرین کے علاقوں میں آگ وخون کی ہولی کھیلی گئی۔ بقول حامد خان ایڈووکیٹ، شہر میں دفعہ 144 لگی ہوئی تھی جبکہ کراچی کے کمشنر روئیداد خان تھے۔[51] 5 جنوری کو کراچی میں فوج طلب کر لی گئی۔ کراچی سے دارالحکومت کی منتقلی کو محض ایوب خان سے جوڑنا حقیقت سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ کراچی کو تو عارضی دارالحکومت ہی بنایا گیا تھا اور جگہ کے انتخاب کی کمیٹی 1950ء سے کام کر رہی تھی۔ 1953ء میں اس کمیٹی کے چیئرمین بریگیڈیئر یحییٰ خان تھے۔ تاہم اس مسئلہ کو ایوب خان کے خلاف استعمال کیا گیا۔ ایوب خان کی قومیتی لسانی شناخت کو بھی استعمال کرنے کے شواہد ہوں گے۔ تاہم یہ تینوں قسم کے واقعات دراصل ایک ہی طرح کی سیاست کا تسلسل تھا۔ مضبوط مرکز کے حامیوں کے فیصلہ کے تحت کراچی میں بڑے پیمانے پر صنعتیں لگانے کی وجہ سے پورے ملک سے لوگ یہاں آنے لگے۔ جب ایک ہی جگہ پر ساری سرمایہ کاری ہوگی تو لامحالہ شہر کی آبادی، حجم سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ یوں پیچیدگیاں پیدا ہونا لازم تھا۔ بدقسمتی سے کراچی کے ترقی پسندوں نے بھی اس صورتحال پر درست تجزیے نہیں کئے تھے۔ وہ اپنی شناخت کو سندھ کے ساتھ جوڑنے کے حوالے سے تحفظات رکھتے تھے۔ جنرل سیکریٹری کراچی یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین اور این ایس ایف کے رہنما (76-1971) خورشید حسنین نے برملا کہا ''مہاجر شناخت تو ہمیشہ سے کراچی یونیورسٹی میں موجود تھی۔ ہم نے کبھی خود کو سندھ کا حصہ نہیں سمجھا''۔[52] کراچی سندھ کا تاریخی حصہ تھا۔ مرکز کی وجہ سے دیگر قومیتوں کے لوگ بھی کراچی آ رہے تھے۔ ان حالات میں ذرا سی چنگاری بھی سارے بندوبست کو خاکستر کرنے کا کام کر سکتی ہے۔ یاد رہے، جب کراچی سے مرکز اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا تو ''کراچی صوبہ محاذ'' کھڑا کیا گیا جس پر سندھیوں نے ردِعمل کا مظاہرہ کیا۔ یوں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بالعموم سندھ اور بالخصوص کراچی میں اندر ہی اندر اک لاوا اُبل رہا تھا جو مضبوط مرکز کے فلسفہ کی دین تھا۔

1965ء کی جنگ کے بعد ایوب خان کا زوال شروع ہو گیا۔ 65ء کی جنگ کو اسلام اور کفر کی جنگ قرار دینے والے جب 17 روز بعد ہی ''کفر'' سے مذاکرات کرنے لگے تو مخالفین نے اسی خلاء کو ان کے خلاف بخوبی استعمال کیا۔ ایوب خان کو بھرپور عوامی تحریک کے بعد اقتدار چھوڑنا پڑا مگر چیف آف آرمی سٹاف یحییٰ خان نے اقتدار کی آئینی طور پر منتقلی کو غیر ضروری قرار دے دیا۔ ایوب مخالف تحریک میں سے پاکستان پیپلز پارٹی کا ظہور ہوا تاہم مرحومہ بے نظیر بھٹو نے 2007ء میں اپنے انٹرویوز میں اقتدار کی یحییٰ خان کو منتقلی پر سیاستدانوں کی خاموشی کو ہدف تنقید بنایا۔ دوبارا اقتدار سے نکلنے کے بعد محترمہ کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ جب بھی کسی عوامی تحریک کا نتیجہ مارشل لاء کے حق میں نکلتا ہے تو اس سے تحریک کے مقاصد ہی بے ثمر ہو جاتے ہیں۔[53]

یحییٰ خان نے پیرٹی کے فارمولے اور وَن یونٹ کے خاتمہ کا اعلان کر کے نیک نامی کمانے کی ناکام کوشش کی۔ یہ یحییٰ خان ہی تھے کہ جن کے دور میں شریف کمیشن کی تعلیمی اصلاحات کو منسوخ کر کے ایسی تعلیمی پالیسی متعارف کروائی گئی جو ملک پاکستان کو بھارت دشمنی اور مذہبی بنیاد پرستی کی راہ پر ڈالنے کا دیباچہ ثابت ہوئی۔[54] یحییٰ خان کے وزیرِ اطلاعات جنرل شیر علی پٹودی کو ''نظریہ پاکستان'' کے خالقوں میں شمار کیا جاتا ہے کہ جنہوں نے مذہبی بنیاد پرستی کو مرکزیت پسندی اور بھارت دشمنی کے لیے استعمال کرنے کی بنیادیں رکھیں۔

1970ء کے انتخابات سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک

اُردو، اسلام اور مضبوط مرکز کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود 1970ء کے انتخابی نتائج نے ایک دفعہ پھر یہ بات ثابت کی کہ صوبوں کے مسائل حل نہ کرنے سے وفاقیت کمزور ہوئی ہے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ، سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی جبکہ سرحد و بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) اور جمعیت علماء السلام (مفتی محمود گروپ) مقبول عام پارٹیوں کی حیثیت سے سامنے آئے۔

مضبوط مرکز کے حامیوں کو تو عوامی لیگ کے چھ نکات ''موت کا پروانہ'' معلوم ہوئے کہ اگر ان پر عمل ہو گیا تو مرکز صوبوں کے رحم و کرم پر ہوگا۔ ہمیشہ کی طرح طاقت کے استعمال کو مسئلہ کا حل قرار دینے کی حکمتِ عملی حرکت میں آئی۔ نو منتخب اسمبلی کا اجلاس بلا کر معاملات حل کرنے کی بجائے اسے منسوخ کر دیا گیا اور 26 مارچ 1971ء کو فوجی آپریشن شروع ہو گیا۔ مغربی پاکستان میں فوجی آپریشن کے خلاف مؤثر آواز نہیں اٹھائی گئی۔ بہت سے لوگ تنہائی اور خاموشی میں چلے گئے تو بہت سے ایسے بھی تھے جو آپریشن کے حق میں دلائل دے رہے تھے۔ حامد خان کو دیئے گئے انٹرویو میں انسانی حقوق کمیشن کے حالیہ ڈائریکٹر آئی اے رحمٰن نے روزنامہ ''آزاد'' کا حوالہ دیا کہ جس میں لاہور کے 50 شہریوں کے دستخطوں سے جاری ہونے والے بیان کا ذکر ہے جو فوجی آپریشن کے خلاف تھا۔[55] تاہم جب 1971ء کے آخری مہینوں میں بھارتی فوجوں نے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے ڈھاکہ کا رُخ کیا تو اس نحیف آواز کا خاموش رہنا معنی خیز تھا۔ 16 دسمبر کو پاکستان دولخت ہو گیا جسے ہمیشہ تاریخ میں صوبوں اور قومیتی و لسانی مسائل سے نمٹنے میں ناکامی سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔

نیا پاکستان اور بھٹو حکومت

1972ء کا پاکستان اس بات کا متقاضی تھا کہ اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کر کے نیا پاکستان کیسے تعمیر کیا جائے۔ تاہم 37 سال گزرنے کے باوجود ہم نے یہ سبق تا حال نہیں سیکھا۔ 1973ء کا آئین اک ایسی دستاویز تھا کہ جس میں نہ صرف صوبوں کو تحفظ دینے کا بندوبست موجود تھا بلکہ قومیتی لسانی تنوع کو تسلیم کرنے کے عمل کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ اگر اس آئین پر عمل ہونے دیا جاتا تو پاکستان پائیدار ترقی کی طرف گامزن ہو سکتا تھا۔ تقریباً دس ماہ تک صوبہ سرحد و بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کی حکومتیں رہیں مگر لسانی و قومیتی تنوع کے حوالے سے کوئی قابل ذکر کام نہ ہو سکا۔ بلوچستان میں پختون بلوچ مسئلہ تھا جبکہ صوبہ سرحد میں جمعیت علماء اسلام، قومیتی لسانی مسائل پر نیپ سے اتفاق نہیں کرتی تھی جبکہ صوبہ سرحد میں ہندکو، ہزارہ (پنجابی) بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ 20 دسمبر 1971ء سے 14-اگست 1973ء تک پاکستان میں عارضی آئین کے تحت حکومت کام کرتی رہی۔ اس دوران بلوچستان میں دوسرے صوبوں کے ملازمین کو واپس ان کے صوبوں میں بھیجنے، سندھ میں اُردو۔ سندھی لسانی فسادات اور سرحد میں شریعت کے نام پر احکامات صادر کرنے جیسے اقدامات سے صوبہ مرکز تعلقات میں بگاڑ بڑھا۔ بی ایس او کے بانی و جنرل سیکریٹری رحیم ظفر مقیم تربت نے 70ء کی دہائی کی ابتداء میں طالبعلم تنظیم کے کچھ رہنماؤں کے عراق کی حکومت سے تعلقات بارے جو اشارے کئے ہیں وہ اس مسئلہ کو مزید پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔[56]

بلوچستان کی حکومت کو توڑنا اور صوبہ سرحد کی حکومت کا استعفیٰ ایسے واقعات ہیں کہ جنہیں صوبہ مرکز تعلقات کے حوالے سے کسی بھی طرح خوش آئند قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے باوجود 1973ء کے آئین پر بالعموم نیپ اور جمیعت علماء اسلام نے بھی اتفاق کر لیا۔ تاہم آئین کی تشکیل کے بعد بھی صوبہ سرحد اور بلوچستان کے حالات بدستور خراب ہی رہے۔ حیدرآباد ٹربیونل کے بعد صوبہ سرحد اور بلوچستان میں انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے والوں کا سویلین اقتدار اک خواب رہ گیا کہ جس نے مرکز میں سویلین اقتدار پر بھی مہلک اثرات چھوڑے۔

بھٹو کے اے ڈی سی اور پاکستان ایئر فورس کے ایک افسر نے ٹی وی انٹرویو[57] میں بتایا کہ قومی اتحاد کی تحریک کی ابتداء میں بھٹو پختون، بلوچ رہنماؤں کو رہا

کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے مگر ایک ملاقات میں چیف آف آرمی سٹاف ضیاء الحق نے اس فیصلہ کو ملک وقوم سے غداری قرار دے کر بھٹو کو ایسا کرنے سے روک دیا۔اب ذرا ان کی ہوشیاری ملاحظہ فرمائیں کہ جب ضیاء الحق نے 5 جولائی کو اقتدار سنبھالا تو انہوں نے آتے ہی پختون بلوچ رہنماؤں کو رہا کر کے ''رام'' کرنے کی کوشش کی۔ یہ واقعہ بذاتِ خود اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ طاقت کے مراکز وہی کھیل جاری رکھے ہوئے تھے جو 50ء اور 60ء کی دہائی میں ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

1972ء اور 1975ء میں کی جانے والی نیشنلائزیشن نے بھی مرکزیت پسندی کو مزید مضبوط کیا۔ چھوٹے بڑے صنعتی یونٹ، بینک، انشورنس کمپنیاں اور تعلیمی ادارے قومیانے کی وجہ سے خصوصاً کراچی اور پنجاب میں کاروباری حلقے عدم تحفظ کا شکار ہو گئے کہ جس کا اظہار قومی اتحاد کی تحریک میں نمایاں تھا۔''قومیانے'' کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ریاست عام آدمی کو صحت اور تعلیم کی معیاری سہولتیں دے گی۔مگر ''قومیانے'' کی پالیسی ایسے ترتیب دی گئی کہ بیوروکریسی ہی کے حجم میں اضافہ ہوا جبکہ معیارِ تعلیم وصحت مزید گر گیا۔منتخب نمائندوں کے حق میں بنایا گیا 1973ء کا آئین غیر جمہوری قوتوں کو پہلے دن سے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔26 سال بعد پاکستان میں پہلی دفعہ منتخب حکومت کو اقتدار ملا تھا۔اس آئین میں صوبہ مرکز تعلقات کے حوالے سے نیا ویژن موجود تھا۔اگر اس بندوبست کو چلنے دیا جاتا تو 15,10 سال میں پاکستان حقیقی فلاحی وفاقی ریاست کی طرف سفر کر سکتا تھا۔بھٹو حکومت کا خاتمہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ سیاستدانوں کو اقتدار کے حصول سے پیشتر بہت سے اہم قومی اُمور پر اتفاق رائے پیدا کرنا ضروری ہے۔کسی ایسے اتفاق رائے کی غیر موجودگی میں غیر جمہوری قوتوں کی دراندازی کے مواقع اور بڑھ جاتے ہیں۔

ضیاء الحق اور انتشار

ضیاء الحق کا دور صوبہ مرکز تعلقات کے حوالے سے اس لیے بدترین دور ہے کہ اس میں لسانی،قومیتی اور مذہبی تضادات کو ریاستی سطح پر اُبھارنے کا فریضہ سرانجام دیا گیا۔پیپلز پارٹی ایک وفاقی جماعت تھی اور اسے ختم کرنا ضیاء الحق کا مشن تھا۔ 1971ء کے بعد مرکز بنگالیوں کی اکثریت سے تو جان چھڑا چکا تھا تاہم نئے پاکستان میں پنجابیوں کی اکثریت سے نمٹنے کا بندوبست ضروری تھا۔بھٹو دور میں اس ایجنڈے پر عمل دو وجوہات کی بناء پر نہ ہو سکا۔

1- بھٹو خود پنجاب میں مقبول ترین رہنما تھے بلکہ انہیں پنجاب میں اکثریت ہی کی وجہ سے اقتدار ملا تھا۔

2- مرکزی سول ملٹری بیوروکریسی کے لیے پہلا درد سر تو منتخب مرکزی حکومت تھی کہ جسے چلتا کرنا ضروری تھا۔

5 جولائی 1977ء کے بعد مرکز نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ پنجاب کو پیپلز پارٹی کی حمایتی ومخالف قوتوں میں منقسم کرنے سے مرکز پنجاب کی جمہوری طاقت سے بھی بچ سکتا تھا اور ضیاء الحقی مشن بھی پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا۔اس ایجنڈے کی تکمیل کے لیے قومیتی،لسانی و مذہبی نفرتوں کا معجون بنایا گیا۔کراچی میں لسانی سیاست کو مضبوط کیا گیا تو اندرون سندھ،سرحد اور بلوچستان میں پنجاب مخالفت کو بڑھاوا دیا گیا۔پنجاب مخالف بیان بازی کو پنجاب کے اخبارات میں نمایاں کر کے چھاپا گیا تاکہ پنجابیوں،سندھیوں،پختونوں اور بلوچوں میں حدِ فاصل قائم ہو۔قومیتی ولسانی سیاست کے حوالے سے نئے کھلاڑی آگے لائے گئے جو انتہا پسند بیانات سے ضیاء الحقی مشن کو آگے بڑھاتے رہے۔سندھو دیش،پختونستان،عظیم تر بلوچستان،کنفیڈریشن اور جناح پور کے نعرے لگانے والوں کو ان کی عوام میں تو پذیرائی کبھی نہ ملی البتہ پاکستان کے مقتدر میڈیا میں ان کے بیانات نمایاں انداز میں چھپتے رہے۔دوسری طرف اسلامائزیشن کی طرح ایسے ڈالی گئی کہ جس میں صوبائی خودمختاری کو علیحدگی پسندی قرار دے کر ہدفِ تنقید بنایا جاتا۔ یہ کہا گیا کہ بھارت پاکستان کو توڑنا چاہتا ہے اس لیے وہ پاکستان میں قومیتی ولسانی تحریکوں کی پشت پناہی کر رہا ہے۔اُردو اور اسلام کا ٹانکا تو ''نظریہ پاکستان'' کی شکل میں جنرل شیر علی پٹودی جوڑ گئے تھے تاہم ضیاء الحق دور میں اسے بطور ہتھیار بخوبی استعمال کیا گیا۔پنجابی،سندھی،بلوچی اور پشتو مادری زبانوں کی حمایت کرنے والوں کو غدار کہنا اس مہم کا حصہ تھا۔ملک کے مستقبل سے وابستہ کالا

باغ ڈیم جیسے اہم منصوبوں کو بھی اس مہم میں کمال مہارت سے استعمال کیا گیا۔ضیاء الحق اور پرویز مشرف بیس سال تک پاکستان میں بلاشرکت غیرے حکمران رہے مگرانہوں نے اس مسئلہ کوحل کرنے کی بجائے ''لڑانے'' کے لیے ہی استعمال کیا۔ پاکستان میں 100 صوبے بنانے کا اعلان کر کے ضیاء الحق نے مرکز کی سوچ کا اعادہ کیا کہ اگر چاروں صوبوں کی عوام پر مشتمل کوئی مضبوط عوامی تحریک بنے گی تو حکمران نئے صوبوں کی تحریک سے اسے کمزور کرسکیں گے۔تین صوبوں اور ایک صوبے کے درمیان لڑائی کروانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ یوں ملک بھر میں کوئی ایسی لہر نہ بن سکے جو مرکز کے لیے چیلنج بن سکے۔مرکزیت پسندی کے حامی حکمران تو چاہتے تھے کہ کوئی ایسی سیاسی جماعت نہ رہے جس میں سندھی، پنجابی، پختون اور بلوچ سبھی شامل ہوں۔اس میں حکمرانوں کی چالوں کا بھی ہاتھ ہے مگراس کے ساتھ ساتھ قومیتی، ثقافتی ولسانی سیاست کرنے والوں کی موقعہ پرستیوں اور غلط فیصلوں کا بھی دخل ہے۔ایک حدتک مرکزی سرکاراس میں کامیاب رہی مگرکس قیمت پر؟ یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ قیمت تھی پاکستان میں انتشار۔

ضیاء الحق کے بعد ٹوٹتی بنتی حکومتیں

ضیاء الحق دور میں ملک انتشار کا شکار ہو چکا تھا۔اس سے نکلنے کے لیے 15,10 سالہ ویژن، اہم قومی امور پر سیاسی تصفیہ اور صوبوں میں اعتماد کی فضاء کا ہونا پہلا قدم تھا۔1988ء کے اواخر میں ضیاء الحق تو مر چکا تھا مگراس کا مشن جاری رکھنے والوں نے انتخابات سے قبل ایسا بندوست کر دیا کہ سیاستدان کسی سیاسی تصفیہ کی طرف نہ بڑھ سکیں۔ بے نظیر بھٹو نے 1988ء میں ''نئے سماجی تصفیہ'' کی بات تو کی مگرکسی ایسے تصفیہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خود ''ایوانِ صدر'' تھا۔ یہاں ایم آرڈی کی اس قرارداد کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو صوبائی خودمختاری کے حوالے سے اگست 1986ء کو منظور کی گئی تھی۔[58] یاد رہے 10 اپریل کو بے نظیر کی لاہور آمد نے صوبوں، قومیتوں اور زبانوں میں انتشار کے ضیاء الحقی منصوبہ کو برباد کرنے کی نوید سنائی تھی۔مرکزیت پسند قوتوں کو بھی لگا کہ 1983ء کی تحریک کو ''سندھی کارڈ'' کے طور پر مشہور کرنے کے باوجود بے نظیر کے ساتھ پنجابی ویسے ہی کھڑے ہیں جیسے ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ تھے۔ جہاں 10 اپریل 1986ء کے فقید المثال جلوس نے حکمرانوں کے وسوسوں کو بڑھاوا دیا وہیں ایم آرڈی میں موجود چھوٹی پارٹیوں کو بھی اپنی سیاسی حیثیت بارے تحفظات لاحق ہو گئے۔اس نازک موقع پر جب ایم آرڈی کی پارٹیوں نے مرکز کے پاس تین شعبہ جات کے حوالے سے بظاہر انقلابی قرارداد منظور کی تو بے نظیر بھٹو کے پاس دو راستے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے ہمیشہ خود کو بطور وفاقی پارٹی ہی پیش کیا تھا۔وہ مرکز کو کمزور کرنے کی بجائے صحیح وفاقیت پر مشتمل پاکستان بنانے کی دعویدار تھی۔1973ء کا آئین ان کے دعویٰ کا زندہ ثبوت بھی تھا کہ جس کی بحالی کے لیے تحریک بحالی جمہوریت (ایم آرڈی) بنائی گئی تھی۔صوبہ مرکز تعلقات کے حوالے سے ایسی قراردادیں جمہوری نظام کی بحالی تک مؤثر رکھی جاتیں تو اعتماد کی فضاء قائم رہتی۔اگراس لمحہ پر بے نظیر بھٹو ایم آرڈی کی جماعتوں سے الگ ہو جاتیں تو ضیاء الحق کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات کوئی نہ ہوتی۔ایک زیرک سیاستدان کی طرح بے نظیر بھٹو نے اس ''الجھن'' کو ضیاء الحق اور مضبوط مرکز کے حامیوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا۔ جب وہ دباؤ بڑھانے میں کامیاب رہیں تو انہوں نے نیا اتحاد بنا کر 1988ء کے انتخابات میں حصہ لیا۔20 سال گزرنے کے باوجود بھی مسلم لیگ (ن) اور پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادتیں قومیتی سیاستدان کے ''کمزور مرکز'' والے فارمولے سے پوری طرح متفق نہیں ہیں۔تاہم پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف اس قرارداد سے مراجعت کو عہد شکنی سے تعبیر کرنے والے یہ جانتے ہیں کہ وہ کمزور مرکز کے حوالے سے تادم تحریر رائے عامہ نہیں بنا سکے۔1988ء سے 1998ء کے درمیان بے نظیر اور نواز شریف کے ادوار میں مخاصمت اس قدر زیادہ رہی کہ کسی سیاسی تصفیہ کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ گومیاں نواز شریف کے پہلے دور میں این ایف سی ایوارڈ کے حوالے سے پیش رفت ہوئی مگرکسی بڑے قومی سیاسی تصفیہ کے بغیر ایسی پیش رفت بھی اپنا اثر کھو دیتی ہے۔

پرویز مشرف کے اقتدار میں، ضیاء الحق اور ایوب خان کی طرز پر ایک دفعہ پھر مقامی حکومتوں کے نظام کو سیاستدانوں خصوصاً صوبوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کرنے کی طرح ڈالی گئی۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر سیاستدانوں اور صوبائی قیادتوں نے ازخود عدم مرکزیت پر تصفیہ کر کے سیاسی بندوبست بنایا ہوتا

تو فوجی حکمرانوں کے لیے اسے استعمال کرنا مشکل ہوتا۔ ہمارے ہاں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ مرکز سے اختیارات صوبائی دارالحکومت کو منتقل کرنے کے حامی، اختیارات کو صوبائی دارالحکومت سے اضلاع اور یونین کونسلوں کو دینے کے قائل نہیں ہیں۔ ضیاء الحق کی مانند پرویز مشرف بھی مرکزیت پسندی کے قائل تھے اور اپنی حکومت کے دوام کے لیے صوبوں اور قومیتوں سمیت مختلف گروہوں کو لڑانے میں ماہر بھی۔

جب مئی 2006ء میں محترمہ شہید بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف نے میثاق جمہوریت پر دستخط کیے تھے تو یہ امید بندھ گئی تھی کہ سیاستدان اک نئے تصفیہ کی طرف گامزن ہیں۔ تام اس وقت بھی ایسے تصفیہ میں قومیتی سیاست دانوں کی عدم موجودگی کھٹکتی تھی۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی جیسی وفاقی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ صوبوں کی مقبول عام قیادتوں کا ایسے تصفیہ میں شامل ہونا انتہائی اہم قدم تھا جس کا تاحال انتظار ہے۔

نئی جمہوری حکومت اور سیاست کے تقاضے

18 فروری کے بعد یہ امید تھی کہ منتخب اسمبلی میں کسی ایسے تصفیے کی طرف بڑھنے میں پیش رفت ہوگی کہ جس کی بنیاد مئی 2006ء میں رکھی گئی تھی۔ تاہم تادم تحریر لوگ ایسی پیش رفت کے منتظر ہیں۔ البتہ پہلی دفعہ پاکستان میں ایسا سیاسی بندوبست گذشتہ ڈیڑھ سال سے چل رہا ہے جو مرکزی وصوبائی سطح پر اکثریتی ووٹ لینے والے اراکین پر مشتمل ہے۔ گو بھارت کے ساتھ سرد جنگ کی باتیں ماضی کا قصہ بن رہا ہے مگر سرحد اور بلوچستان کے بارڈر پر جاری دہشت گردی اور مذہبی انتہا پسندی نے ساری سیاست کو اپنی گرفت میں جکڑا ہوا ہے۔ فاٹا اور مالاکنڈ میں فوجی آپریشن پر تمام مقبول عام سیاسی قیادتوں کے اتفاق رائے کے باوجود پاکستانی معاشرے میں مذہبی انتہا پسندی سے نمٹنے کے حوالے سے ''اتفاق رائے'' کی عدم موجودگی میں فوجی کارروائی کے بے توقیر رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ وفاق اور صوبوں میں جمہوری بندوبست کا تسلسل اور مذہبی انتہا پسندی سے نمٹتے ہوئے صوبائی خودمختاری اور قومیتی ولسانی تنوع جیسے مسائل پر اتفاق رائے بنانے کے لیے جدوجہد کرنا آج کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

صوبائی خودمختاری کی حمایت میں علیحدگی پسندی کے نعرے لگانے والے جانتے اور نہ جانتے ہوئے مرکزیت پسند قوتوں کا راستہ آسان بناتے ہیں۔ آج صوبائی خودمختاری کو عدم مرکزیت کے اصول کے ساتھ جوڑ کے دیکھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ عوام کو فیصلہ سازی میں شریک کیے بغیر پائیدار جمہوری بندوبست نہیں بن سکتا۔ یہی وہ راستہ ہے کہ جس کے ذریعے صوبائی قیادتیں وسیع تر عوامی حمایت بھی حاصل کر سکتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ 1973ء کے آئین کو 5 جولائی 1977ء کی شکل میں بحال کرنے کے بعد تمام آئینی ترامیم پر از سرنو غور کے لیے کمیشن بنایا جائے۔

مہذب ممالک کی طرح قومیتی ولسانی تنوع کے اصول کو اپناتے ہوئے زبانوں کے حوالے سے قومی کمیشن کی تشکیل دوسرا لازمی قدم ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ غیر جمہوری طاقتیں زبانوں کے مسئلہ کو کسی بھی عوامی تحریک کے خلاف باآسانی استعمال کر سکتیں ہیں۔

الیکشن کمیشن، مشترکہ مفادات کونسل اور قومی وصوبائی فنانس کمیشنوں جیسے تمام اداروں کو مؤثر اور آزاد ادارے کی حیثیت میں کام کرنا چاہیے جو پارلیمنٹ میں اپنی اپنی سفارشات بحث کے لیے بھیجیں تاکہ ان اہم اُمور پر قانون سازی ہو سکے۔

کمزور صوبے، مضبوط مرکز یا مضبوط صوبے اور کمزور مرکز کی لامتناہی بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے ایسا وفاقی بندوبست بنانا ضروری ہے جو منتخب نمائندوں کے تابع ہو اور تمام اکائیوں کے تحفظات کو دور کرنے کی اہلیت بھی رکھتا ہو۔

یہ ضروری نہیں کہ وفاقیت اور صوبائیت میں ہمیشہ تضاد ہی ہو۔ اگر وفاقیت کو صوبوں کی کمزوری سے مضبوط کیا جائے گا تو ردِعمل میں علیحدگی پسندی جنم لیتی ہے۔ وفاقیت تمام اکائیوں کو لے کر چلنے سے عبارت ہے۔ تاہم عدم مرکزیت کے جس فلسفہ کو صوبائی خودمختاری کے حامی مرکز کے لیے ضروری گردانتے ہیں اسے خود

صوبہ کے لیے بھی ضروری قرار دیں۔ جیسے کچھ اختیارات مرکز کے پاس ہونے ضروری ہیں ویسے ہی کچھ اختیارات پر صوبہ کے حق سے بھی انکار مشکل ہے۔ بہت سے اختیارات، خصوصاً روزمرہ زندگی سے متعلق، ایسے ہیں جن میں ضلع، تحصیل اور یونین کونسل کا استحقاق زیادہ ہے۔ پاکستان کی طرح امریکہ میں بھی کچھ ریاستیں بڑی ہیں اور کچھ بہت چھوٹی۔ تاہم مضبوط سینٹ، آزاد عدلیہ اور آزاد الیکشن کمیشن کی موجودگی میں وفاق سب کے تحفظات کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ آج پاکستان میں اک ایسے ہی تصفیہ کی طرف بڑھنے کی ضرورت ہے۔ بھارت کی طرح مرکز کو صوبے توڑنے کا اختیار دینا صوبائی خودمختاری کے اصولوں کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1973ء کا آئین بنانے والوں نے اس معاملے میں صوبوں کی آراء کو اولیت دی تھی۔ پنچایتی راج کی عدم موجودگی اور صوبوں کو توڑنے کے مرکزی اختیار (آرٹیکل 3 اور 4: بھارتی آئین) کی وجہ سے بہت سے ماہرین تو بھارت کے آئین کو وفاقی آئین ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔[59] اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبائی خودمختاری اور قومیتی ثقافتی ولسانی تنوع کو تسلیم نہ کرنا پاکستان کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تاہم اس جدوجہد کو نہ تو جمہوری تسلسل اور نہ ہی نچلی سطح پر اختیارات کی منتقلی یعنی عدم مرکزیت سے متصادم ہونا چاہیے۔ ایک آخری بات کے طور پر یہ بھی غلط نہ ہوگا کہ سیاسی جماعتیں جس جمہوری تسلسل اور عدم مرکزیت کو پاکستان کے لیے ضروری سمجھتی ہیں اس کا پرتو ان سیاسی جماعتوں کے اندرونی ڈھانچوں میں بھی نظر آنے سے ان کی بات زیادہ باوزن ہوگی اور اسے عوام میں زیادہ پذیرائی بھی ملے گی۔

حوالہ جات

1- قومیتی، ثقافتی ولسانی حوالے کوانگریزی میں لفظ Ethinicity سے بیان کیا جا سکتا ہے جس کا ترجمہ جانتے یا نہ جانتے ہوئے ''نسلی، نسلیاتی یا نسل پرستی'' کیا جاتا ہے۔ ایسے تراجم قومیتی، ثقافتی ولسانی حقوق کا منفی تاثر مضبوط کرنے میں ہمیشہ معاون رہے ہیں۔ ایسے ہی تراجم کی ایک مثال انگریزی لفظ سیکولر بھی ہے جس کا ترجمہ ''لادینیت'' کرنے کے پیچھے کارفرما مخصوص ذہنیت سے ہم سب بخوبی آگاہ ہیں۔

2- اس مقالہ میں زیادہ تر بات چیت انہی خطوں بارے ہوگی جن پر مشتمل ملک پاکستان اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آیا تھا۔ تاہم جہاں ضرورت محسوس کی گئی وہاں جنوبی ایشیاء کے دیگر علاقوں کا ذکر بھی کیا جائے گا۔

3- ''سر جان ہاب ہاؤس اور پنجاب پر قبضہ''، بحوالہ لارڈ براگٹن (Lord Broughton) پیپرز، سر جیت سنگھ بال، پنجاب ہسٹری کانفرنس'' پٹیالہ پنجاب۔

نوٹ: سر جان ہاب ہاؤس، صدر بورڈ آف کنٹرول، برطانیہ بعد ازاں لارڈ براگٹن کہلاتے تھے۔ ان پیپرز میں لارڈ ڈلہوزی کو لکھے خط کا حوالہ موجود ہے جو پنجاب پر قبضہ کی اہمیت کے حوالے سے 6-اکتوبر 1849ء کو لکھا گیا۔

4- باپ اور بیٹی۔ اک سیاسی سوانح حیات (انگریزی) از بیگم جہاں آرا شاہنواز، مطبوعہ نگارشات، انارکلی لاہور، مغربی پاکستان، 1971ء۔

5- آپ بیتی حکیم اجمل خاں، مطبوعہ دہلی۔

6- گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1919ء۔ سیکشن 1۔

7- تاریخ تعلیم ہند (1800ء تا 1965ء) سید نوراللہ اور جے پی نارائین۔ نئی دہلی۔

8- احرار اور کانگرس، مجلس احرار السلام۔

9- پاکستان کی آئینی سیاسی وتاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء۔

10- سر سکندر حیات از افتخار حیدر ملک مطبوعہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، اسلام آباد، 1985ء۔

11- گولڈ اینڈ گنز آف پختون فرنٹیئر از خان عبدالقیوم خان، اُردو ترجمہ فاروق قریشی مطبوعہ گوتم پبلشرز، 1995ء۔

12- آزادی کی طرف دس سال (47-1937) انگریزی، کانجی دوارکا داس، کلکتہ، 1968ء۔

13- تقسیم ہند۔ قصہ اور حقیقت، (انگریزی) از ایچ ایم سیروائی بھارت، 1990ء۔

14- پاکستان کی آئینی سیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔ مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء۔

15- آزادی کی طرف دس سال(47-1937) انگریزی، کانجی دوارکا داس، کلکتہ۔صفحہ 155۔
16- آزادی کی طرف دس سال(47-1937) انگریزی، کانجی دوارکا داس، کلکتہ، 1968ء۔
17- آزادی کی طرف دس سال(47-1937) انگریزی، کانجی دوارکا داس، کلکتہ۔صفحہ 159۔
18- منشور سندھ ساگر جمنا نربدا پارٹی، مطبوعہ کتاب مولانا سندھی از ہاجن (انگریزی)۔
19- سر سکندر حیات از افتخار حیدر ملک مطبوعہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ کلچرل ریسرچ، اسلام آباد، 1985ء
20- بھارتی آئین کی تشکیل (جلد اوّل) دستاویزات، بینرجی۔وائسرائے بنام محمد علی جناح۔
21- آزادی کی طرف دس سال(47-1937) انگریزی، کانجی دوارکا داس، کلکتہ۔صفحہ 182۔
22- مولانا عبیداللہ سندھی، زندگی اور افکار۔مقالہ برائے پی ایچ ڈی۔از سید احمد علیگڑھ، مطبوعہ جامعہ ملیہ دہلی، بھارت۔
23- تقریر قائداعظم 11-اگست 1947ء، ریکارڈ آئین ساز اسمبلی 1947ء، جلد 2۔
24- جناح سے ضیاء تک، محمد منیر، وین گارڈ بکس لاہور، 1980ء۔
25- ریکارڈ آئین ساز اسمبلی۔پیپر، 11-اگست 1947ء جلد نمبر 2۔
26- قائداعظم کی تقاریر (کراچی 1948ء)، صفحہ 93-92۔
27- قائداعظم کی تقاریر 24 مارچ 1948ء، ڈھاکہ یونیورسٹی مشرقی بنگال اور www.pakistan.gov.pk / quaid/speechs31htm
28- پہلی تعلیمی کانفرنس نومبر 1947ء دستاویزات حکومت پاکستان۔
29- انٹرویو تسنیم صدیقی مطبوعہ سہ ماہی ''ڈویلپمنٹ ویژن''، شمارہ نمبر 2، لاہور، اگست 2008ء۔
30- دستاویزات آئین ساز اسمبلی جلد 4-1948ء۔
31- روزنامہ ''جنگ'' 7 جولائی 2009ء۔
32- آئین ساز اسمبلی کی دستاویزات 1949/50، جلد 4۔
33- آئین ساز اسمبلی کی دستاویزات تقریر: میاں افتخار الدین، مارچ 1948ء۔
34- پاکستان میں آئین سازی کے المیے۔جی ڈبلیو چوہدری، ویسٹرن پولیٹیکل کوارٹرلی، جلد 8، نمبر 4 (دسمبر 1955ء۔صفحہ 589)۔
35- آئین اسمبلی دستاویزات جلد 1۔
36- حسین شہید سہروردی ایک سوانح از شائستہ سہروردی اکرام اللہ، انگریزی مطبوعہ آکسفورڈ 1991ء۔
37- Public & Representation offices (Disqualifications) Act-1949
38- انٹرویو تسنیم صدیقی مطبوعہ سہ ماہی ''ڈویلپمنٹ ویژن''، شمارہ نمبر 2، لاہور، اگست 2008ء۔
39- حوالہ انٹرویو منظور اعجاز مطبوعہ ''عوامی جمہوری فورم'' نمبر 48۔
40- بحوالہ انٹرویو کمال لوہانی، اگست 2008ء، ڈھاکہ مطبوعہ ''عوامی جمہوری فورم''، شمارہ نمبر 44، لاہور۔
41 پاکستان کی آئینی و سیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء۔
42- پاکستان کی آئینی و سیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ، سپرانوٹ 1۔صفحہ 30۔

43- پاکستان کی آئینی وسیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء۔

44 پاکستان کی آئینی وسیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔صفحہ 357۔مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء۔

45- پاکستان کی آئینی سیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔

46- International Co-Operation Administration Agency

47- پاکستان کی آئینی وسیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء،صفحہ 203۔

48- بھارت میں وفاقیت اور علاقائیت/رہری ہر بھاٹا چاریا۔انسٹی ٹیوٹ برائے جنوبی ایشیاء۔یونیورسٹی آف ہائیڈل برگ 2005ء۔

49- صدر ایوب کی ریڈیو تقریر یکم مارچ 1962ء، تقاریر ایوب خان جلد 4،صفحہ 170۔

50- پاکستان کی آئینی وسیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء۔صفحہ 271۔

51- پاکستان کی آئینی وسیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء۔صفحہ 3,5۔

52- انٹرویو خورشید حسنین، کتاب طلباء سیاست پر دوبارہ نظر، انگریزی از اقبال حیدر بٹ مطبوعہ برگد، 2009ء۔

53- انٹرویو بے نظیر، ہم ٹی وی۔2007ء۔

54- نئی تعلیمی پالیسی بارے تجاویز۔جولائی 1969ء۔حکومتِ پاکستان۔

55- انٹرویو رحیم ظفر سابق رہنما بی ایس او (اینٹی سردار) نومبر 2005ء مطبوعہ ''عوامی جمہوری فورم'' لاہور۔

56- پاکستان کی آئینی وسیاسی تاریخ (انگریزی) حامد خان ایڈووکیٹ۔مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس پاکستان 2008ء۔صفحہ 408۔

57- جوابدہ پروگرام۔افتخار احمد۔جیو ٹی وی 2009ء۔

58- ضیاء دور میں صوبہ مرکز تعلقات: حکومت اور حزبِ اختلاف کا نقطہ نظر۔سی جی پی راکیسٹس (Rakisits)، پیسیفک افیئرز، جلد 61، نمبر 1، صفحہ 91، 1988ء، یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا، امریکہ۔

59- بھارت میں وفاقیت اور علاقائیت/رہری ہر بھاٹا چاریا۔انسٹی ٹیوٹ برائے جنوبی ایشیاء۔یونیورسٹی آف ہائیڈل برگ 2005ء،صفحہ 16۔

مشن: نصابی وہم نصابی سرگرمیوں کے ذریعے پاکستان کے خواندہ نوجوانوں کے درمیان امن، انصاف اور باہمی تعاون کو فروغ دیا جائے۔

نصب العین: پاکستان کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے درمیان امن انصاف اور باہمی تعاون کو فروغ دینا۔

دائرہ کار: نوجوانوں کی ترقی۔

برگد نوجوانوں کی ایک سماجی تحریک ہے، جس کا آغاز 1997ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ہوا۔ ابتدائی طور پر برگد نے نوجوانوں کے آپسی تعلق کو سمجھتے ہوئے ان کے سماجی رویوں کو جاننے سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ نوجوانوں کے ساتھ جب جمہوریت، تشدد، رواداری اور امن جیسے موضوعات پر بات چیت کی گئی تو انہوں نے اس کام میں بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ یوں 23 مئی 1998ء کو ''برگد'' غیر سرکاری تنظیم رجسٹرڈ ہوئی۔ برگد کو شروع کرنے والوں کا تعلق پنجاب کے تاریخی شہر گوجرانوالہ سے تھا۔ بس برگد نے اپنے کام کا آغاز گوجرانوالہ سے کرنے کی ٹھانی۔ آج برگد نہ صرف گوجرانوالہ کے کالجوں اور مدارس میں کام کر رہی ہے بلکہ لاہور سمیت پاکستان کی 35 یونیورسٹیوں میں برگد خواندہ نوجوانوں اور یونیورسٹی انتظامیہ کے ساتھ رابطہ میں ہے۔
برگد کے کور گروپ سے فارغ التحصیل نوجوان لڑکوں نے علاقہ کے نوجوانوں کے ساتھ کام کا آغاز کیا اور اس منصوبہ کے تحت 5 جون 2004ء میں ''اکھ'' کے نام سے برگد ریسورس سنٹر وجود میں آیا۔ برگد کے رضا کار اس پلیٹ فارم کی بدولت اپنی مدد آپ کے تحت سیاسی، جمہوری، سماجی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے باہمی تعاون کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں۔
برگد کے انہی مقاصد کو آگے بڑھاتے ہوئے برگد کی فارغ التحصیل خواتین نے گوجرانوالہ کینٹ میں ''رتی جناح'' ریسورس سنٹر برائے خواتین قائم کیا جو صرف خواتین میں سماجی مسائل بارے شعور بیدار کرنے کے حوالے سے کام کر رہا ہے۔ برگد کے دونوں ریسورس سنٹروں میں اپنی مدد آپ کے تحت روزانہ کی بنیادوں پر کام ہوتا ہے۔ 5 جون 2007ء تک گزشتہ 3 سالوں میں 7,000 ہزار سے زائد نوجوان ان مراکز سے مستفید ہو چکے ہیں۔

برگد کے چند اہم سنگ میل:

☆ تعلیمی اداروں میں مکالمہ کے کلچر کو فروغ دیا ہے۔
☆ نوجوانوں کے رضا کارانہ جذبات کو عملی اور منظم شکل دی۔
☆ تربیتی پروگراموں سے بڑی تعداد میں نوجوان مستفید ہو رہے ہیں۔
☆ برگد کے تمام تر پروگراموں کی منصوبہ بندی اور ان پر عملدرآمد نوجوان رضا کار خود کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج برگد کے ساتھ نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ہیں جو منظم انداز میں علمی فکری مذاکرے اور تفریحی پروگرام منعقد کرواسکتے ہیں۔
☆ نوجوانوں کے لئے مجوزہ قومی پالیسی کے بنانے میں برگد نے نمایاں طور پر حصہ لیا۔
☆ برگد نے پاکستان میں نوجوانوں کے عالمی دن کو منانے کی روایت کو مضبوط کیا۔
☆ برگد نے مقامی نوجوانوں کے مسائل و امور کے حوالے سے تحقیق و تالیف کو فروغ دیا ہے اور اس کا شائع کردہ مواد پاکستان میں نوجوانوں کے حوالے سے ایک اہم ریسورس ہے۔
☆ برگد نے بالخصوص خواتین میں اعتماد اور ابلاغ کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا ہے، جس کی وجہ سے اُن میں سماجی خوف و ہراس، صنفی برابری، گھریلو تشدد جیسے موضوعات پر بات کرنے کی جرأت پیدا ہوئی ہے۔

امن اور باہمی تعاون

پاکستان اور جنوبی ایشیا کے نوجوانوں کے مابین امن کے فروغ کے لیے اپنی نوعیت کی یہ منفرد کاوش ہے، جس کا آغاز 2003ء میں ہوا تھا۔ پاکستان کے قریباً 35 اعلیٰ تعلیمی ادارے اور جامعات، جبکہ بھارت کی تین اور افغانستان کی دو یونیورسٹیوں کے طلباء اس پروگرام میں شرکت کر چکے ہیں۔ آٹھ ہزار سے زائد طلباء اساتذہ اور دانشور اس پروگرام سے براہ راست مستفید ہو چکے ہیں۔ مزید براں، چالیس ہزار سے زائد افراد نے اسی پروگرام کے حوالے سے مختلف مطبوعات وصول کی ہیں، جن میں کثیر تعداد طلباء و طالبات کی ہے۔ اس پروگرام کی ایک اہم خصوصیت ایک سالانہ مذاکرہ برائے امن و باہمی تعاون ہے جو ایک طے شدہ موضوع پر ہوتا ہے۔

نوجوانوں کے لیے علمی فکری مواد

برگد پاکستانی نوجوانوں کے مسائل کے حوالے سے علمی و فکری مواد کی ضرورت سے کماحقہ آگاہ ہے۔ اس ضمن میں برگد نے بہت سا تحریری مواد چھاپا ہے۔ برگد ایک میگزین بھی شائع کرتی ہے، جس میں خواندہ نوجوانوں کے مسائل کے حوالے سے تحریریں شامل ہوتی ہیں۔
یوتھ پالیسی پر برگد کی کتاب اور قومی تعلیمی پالیسی پہ شائع کردہ دو میگزین، جنہیں یوتھ پالیسی اور قومی تعلیمی پالیسی پر نظر ثانی اور عملدرآمد کے لیے ترتیب دیا گیا ہے، ایک حوالہ جاتی مطالعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔
برگد کے تحقیقی کام ''طلباء سیاست بارے قومی سروے'' کو طلباء سیاست کے حوالے سے ایک نئی پیش رفت کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے۔ اس سروے کو ملکی و بین الاقوامی تجزیہ نگاروں نے سراہا ہے۔

☆ وفاقیت اور صوبائی خودمختاری ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ طاقت بن سکتی ہیں۔

☆ قومیتی، ثقافتی، لسانی اور مذہبی تنوع (Diversity) کے اصول کو تسلیم کرنے سے پاکستان مضبوط ہوگا۔

☆ صوبائی خودمختاری کے حامی، صوبائی بیوروکریسی کے برعکس اختیارات کو محض مرکز سے صوبوں میں لانے کی حمایت نہ کریں بلکہ اختیارات کو اضلاع اور یونین کونسلوں تک لے جانے کے بھی علمبردار بنیں۔

☆ الیکشن کمیشن، عدلیہ اور انتظامیہ جیسے اداروں کی غیر جانبداری اور آزادی وفاقیت کو مضبوط کرنے میں معاون ہوسکتی ہے بشرطیکہ ان اداروں کو سیاسی و غیر سیاسی عناصر کی مداخلتوں سے پاک رکھا جائے۔

☆ زبانوں کے حوالے سے قومی کمیشن بنایا جائے تاکہ غیر جمہوری قوتیں زبانوں کے مسئلہ پر انتشار پھیلا کر اپنے مقاصد حاصل نہ کرسکیں۔

☆ وفاق اور صوبوں میں جمہوری بندوبست کا تسلسل اور مذہبی انتہا پسندی سے نمٹتے ہوئے قومیتی، ثقافتی ولسانی تنوع جیسے مسائل پر اتفاق رائے بنانے کے لیے جدوجہد کرنا آج کا اہم ترین مسئلہ ہے۔

برگد

1/1 نظر محمد پلازہ، فرسٹ فلور، قائداعظم ایونیو، راہوالی گوجرانوالہ۔ پاکستان

فون: +92-55-3864920 فیکس: +92-55-3868052

ای میل: / bargadpk@hotmail.com

Info@bargad.org.pk

ویب سائٹ: http://www.bargad.org.pk/

HEINRICH BÖLL STIFTUNG
PAKISTAN